

روح تہذیب

مقالہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

اکتوبر سنہ ۳۲ع

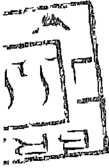
خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔ اے ٹی

پرنسپل ٹریننگ کالج۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ



مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

روحِ تہذیب



مقالہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ

مئی ۱۹۳۲ء

از

خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات کشمیر

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی



بار دوم ۲ ہزار ۳۹ء قیمت ۵ر

انتساب

میں ان اوراق کو اپنی والدہ مرحومہ کے اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں۔ جن کی ذات میں میں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ واضح طور پر اُن صفات کا جلوہ دیکھا جن پر تہذیب نفس کا دارومدار ہے اور جن کی مثال سے مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ انسانی زندگی محض خود غرضی اور نفس پرستی کی مجنونانہ جدوجہد کا نام نہیں بلکہ اس سے بدرجہا ارفع اور اعلیٰ چیز ہے۔

غلام السیدین

دیباچہ

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ہندوستان کے ممتاز ماہر تعلیم ہیں اور اس ملک میں جہاں اب تک تعلیم کا کام محض ایک دفتری اور انتظامی کام سمجھا جاتا ہے یہ بدعت رائج کرنا چاہتے ہیں کہ عملی تعلیم کی بنا نظری غور و فکر اور اصولی تحقیق و تدقیق پر رکھی جائے۔ تعلیم کو تہذیب سے بہت گہرا تعلق ہے بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک تو تہذیب کے سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرنے ہی کا نام تعلیم ہے۔ اس لئے فلسفۂ تعلیم کا مرکزی مسئلہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تہذیب کی حقیقت اور ماہیت معلوم کی جائے تاکہ بچوں اور نوجوانوں کے دل میں اس کا شوق پیدا کیا جاسکے اور انھیں اس کے حاصل کرنے میں مدد دی جاسکے۔

جناب خواجہ صاحب نے اس خطبے میں جو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اکادمی کے جلسے میں پڑھا گیا تھا اور اب رسالے کی شکل میں شائع ہو رہا ہے نہایت دلاویز طریقے سے تہذیب کے حقیقی مفہوم کو بیان کیا ہے۔ اس کے پہلے حصّے میں ایک فرضی خواب کے نام سے ہماری تہذیب کی موجودہ حالت پر

بڑے زور شور سے تنقید کی گئی ہے جو خطیبانہ انداز کے باوجود مبالغہ سے پاک اور اصلیت کے مطابق ہے۔ دوسرے حصے میں تہذیب کے متعلق اصولی بحث اور اس کی تعریف ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہاں بھی موضوع کی خشکی کے باوجود بیان میں خشکی پیدا نہیں ہونے پائی۔ تہذیب کے تمام اہم اجزا کو خواجہ صاحب "رواداری" کے عنوان کے ماتحت لے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رواداری یہاں اصطلاح کے طور پر وسیع معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ حالی کے مرثیۂ غالب سے "معنی لفظ آدمیت" یعنی تہذیب کی تعریف ڈھونڈھ نکالنا خواجہ صاحب کے حسن ذوق کی دلیل ہے اور ان کی "تلاش" قابل داد ہے، اگرچہ اس کے لئے انھیں گھر سے باہر نہیں جانا پڑا۔

سید عابد حسین

روحِ تہذیب

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر — کازدم و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ایک ات عالمِ خواب میں جب تخیل عقل اور مصلحت کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے، میرا اور ان شیخ کا ساتھ ہو گیا جو حیوانوں اور چوپایوں سے بیزار تھے اور ایک انسان کی تلاش میں عمر گذار چکے تھے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی انھوں نے اپنی جستجوئے ناکام کا فسانہ مجھے سُنایا کہ کس طرح

انھوں نے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں میں ایک ایسے انسان کی جستجو کی جس میں وہ تمام صفات موجود ہوں جنھیں وہ انسانیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں لیکن ان کو پے درپے مایوسی کا شکار ہونا پڑا، اور ہمیشہ شریف اور مشہور اور نیک نام انسانوں کی شکل میں ریاکاری، جھوٹ اور نفسانیت کے مجسمے ملے۔

میں ان ستم ظریف حضرت کی طبیعت سے واقف نہ تھا۔ بظاہر نہایت سیدھے سادے مرد معقول معلوم ہوتے تھے۔ میں نے بغیر انجام کو سوچے ہوئے ان سے یہ کہا کہ "شاید آپ کو بدقسمتی سے صرف بُرے لوگوں سے سابقہ پڑا ہوگا میں نے مانا کہ واقعی معنوں میں انسان بہت کم ہیں لیکن بالکل ناپید نہیں۔ میں آپ کو ایسے ایک انسان سے نہیں کئی انسانوں سے ملا دوں گا جن میں وہ صفات موجود ہیں جن کا احترام کرنا سب پر لازم ہے" وہ مسکرائے اور راضی ہوگئے اور میں نے یہ حماقت کی کہ ان کی رہنمائی کا فرض اپنے ذمّے لے لیا۔

میں نے سوچا کہ سب سے پہلے ان کی ملاقات اپنے ایک نوجوان دوست سے کراؤں جو نہایت مہذب اور تربیت یافتہ ہیں اور میرے خیال میں ایک قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ مغرب میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، گھر سے خوش حال ہیں، خاندانی جائداد کی آمدنی معقول ہے اس لئے نوکری یا کوئی اور کام نہیں کرتے ایک شاندار اور خوبصورت کوٹھی میں رہتے ہیں اور مختلف ادبی اور تہذیبی مشاغل میں اپنا وقت گذارتے ہیں۔ قدرت

کی طرف سے بہت صاف ستھرا اور شائستہ مذاق پایا ہے۔ انگریزی، اردو، اور فارسی ادب پر بہت اچھی نظر ہے۔ ادب لطیف کی طرز کے مضامین لکھتے ہیں جن میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ موسیقی سے بہت دلچسپی ہے اور مشرقی اور مغربی موسیقی کو خوب سمجھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انگلستان میں رہ کر اور یورپ کی سیاحت کے دوران میں انھیں مغربی مصوری کے شاہکاروں کو مطالعہ کرنے کا اچھا موقع ملا ہے، اس لئے تصویروں کے حسن و قبح پر بہت قابلیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ گفتگو بہت معقولیت اور شائستگی سے کرتے ہیں اور چونکہ اپنی فرصت میں اکثر موجودہ زمانے کے ادب اور جدید تصانیف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس لئے زمانۂ حال کے رجحانات اور تحریکوں سے باخبر ہیں۔ مختصر یہ کہ خوش نصیبی اور ذاتی قابلیت کی بدولت اپنی زندگی بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے بسر کرتے ہیں اور ہر شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں تہذیب اور شائستگی کے تمام لوازم اور تمام قدریں موجود ہیں۔ خیر، میں ان نئے ملاقاتی کو اپنے دوست سے ملانے لے گیا۔ جب ہم لوگ ان کے یہاں پہنچے تو وہ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے گراموفون بجا رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی بولے "اس ریکارڈ کو غور سے سنئے۔ یہ ایک بہت مشہور روسی گیت ہے" والگا کے کشتیبان کا گیت' جس کو جرمنی کے مشہور اُستاد کرائسلر نے ستار پر بجایا ہے۔" انھوں نے اس کی تمام خوبیاں اور

نکات ہم کو سمجھائے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی با مذاق تحسین کی بدولت ہم نے اس نغمے سے بہت لطف اٹھایا۔ پھر انھوں نے چند ہندوستانی ریکارڈ بجائے، ان کی راگنیوں کی تشریح کی، گانے والوں کی خصوصیات بتائیں، مشرقی اور مغربی موسیقی کا فرق مثالیں دے کر سمجھایا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک اردو اور انگریزی ادب کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد موجودہ رجحانات پر اظہار رائے کیا۔ بہت سی جدید تصانیف ہمیں دکھائیں جو ان کے روز افزوں کتب خانے کی زینت ہیں۔ کہنے لگے "میں شاعری میں قدیم کلاسیکی انداز کا قائل ہوں خواہ آپ مجھے قدامت پسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔ مجھے نہ موجودہ اردو شعراء کے نئے اور بھونڈے تجربے پسند ہیں نہ انگریزی شعراء کی وزن اور قافیہ سے آزاد شاعری جس میں نہ توازن ہے نہ ہم آہنگی۔ بات یہ ہے کہ شعر اور موسیقی میں بہت قریبی تعلق ہے۔ جس شعر میں موسیقیت نہ ہو وہ میرے نزدیک شعر ہی نہیں ...." کچھ دیر تک اس موضوع پر گفتگو رہی۔ اس کے بعد کچھ ذکر سنیما کا چھڑ گیا۔ انھیں سنیما کے متعلق غضب کی واقفیت ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ ہر مشہور ایکٹر اور ایکٹرس نے کن فلموں میں کام کیا ہے، ان کی تنخواہیں کس قدر ہیں، ان کی عمر کیا ہے، آنکھوں اور بالوں کا رنگ کیسا ہے، ان میں سے ہر ایک کی کتنی مرتبہ شادی ہوئی ہے اور کتنی مرتبہ طلاق؟ ان کے پاس ایک نہایت خوبصورت چمڑے کی جلد کی نوٹ بک ہے جس میں انھوں نے بترتیب

حروف تہجی ان تمام فلموں کی فہرست لکھی ہے جو انھوں نے دیکھے ہیں، اور دوسری نوٹ بک میں تمام مشہور ایکٹروں کے حالات درج ہیں۔ انھوں نے اپنے شوق سے ان کی تصویروں کے بہت سے البم جمع کئے ہیں جن میں سی متعدد تصویروں پر صاحبان تصویر کے دستخط موجود ہیں۔ وہ سینما کو محض تفریحاً نہیں دیکھتے بلکہ اس کو ذہنی اور اخلاقی تعلیم کا ایک زبردست آلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کی سیاسی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے، کیونکہ مغربی تہذیب کا پردہ ان کی نظروں میں اسی نے چاک کیا ہے ...... وہ اس گفتگو میں منہمک تھے کہ شیخ صاحب نے ایک بالکل غیر متعلق بات چھیڑ دی۔ کہنے لگے "کیوں صاحب! آپ تو بہت بڑے زمیندار ہیں۔ آپ کے بہت سے گاؤں ہوں گے۔ کبھی آپ کو وہاں جانے کا اتفاق بھی ہوتا ہے"؟

انھوں نے کہا "جی ہاں ابھی کچھ عرصہ ہوا میں اپنے گاؤں گیا تھا اور کچھ روز وہاں ٹھیرا تھا۔" پوچھا "فرمایئے آپ کو گاؤں سے اور گاؤں والوں سے بھی کچھ دلچسپی اور تعلق ہے یا نہیں"؟ انھوں نے کہا "جی ہاں مجھے گاؤں سے اور اس کی سادہ زندگی سے بہت دلچسپی ہے۔ برسات ختم ہونے کے بعد اکتوبر کے مہینے میں، جب زمین زمردیں سبزے اور شفاف پانی سے ڈھکی ہوتی ہے اور میلوں تک ہرے بھرے کھیت لہلہاتے

نظر آتے ہیں، میں اکثر ایک آدھ ہفتہ دیہات میں بسر کرتا ہوں۔ شہروں کی زندگی میں بہت تصنع اور تکلف ہے۔ کبھی کبھی خود بخود جی چاہتا ہے کہ انسان اس سے بھاگ کر چند روز فطرت کے سادہ اور خوشگوار مناظر کا لطف اٹھائے۔ میں جب کبھی چند روز اپنے گاؤں کے مکان میں بسر کرتا ہوں تو ہمیشہ تازہ دم ہو کر لوٹتا ہوں۔ اور ایک خاص اطمینان اور سکون قلب محسوس کرتا ہوں۔ اگر انسان وہاں گندگی اور غلاظت سے محفوظ رہ سکے اور اس کے ساتھ چند کتابیں اور گراموفون وغیرہ ہوں تو تبدیل آب و ہوا اور تبدیل مقام کے لئے گاؤں سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ مزدور اور کاشتکار سب اپنی رعایا ہیں۔ کام کے لئے ہر قسم کی سہولت شکار کا انتظام بہت عمدہ ہو سکتا ہے۔

شیخ صاحب نے کہا "جی ہاں، یہ تو میں سمجھا لیکن میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ کو گاؤں کے لوگوں سے بھی کچھ دلچسپی ہے یا نہیں جو اسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں جس سے آپ بھاگتے ہیں اور جن کے پاس نہ گراموفون ہے نہ کتابیں۔ وہ آپ کی رعایا ہیں نا؟ ان سے آپ کے تعلقات اور مراسم کیسے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "سنئے شیخ صاحب میرا عقیدہ ہے کہ زمیندار کو ہمیشہ کاشتکاروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے چاہئیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ میں سال میں ایک مرتبہ اپنے دیہات میں ضرور جاتا ہوں۔ اپنے کسانوں

اور کاشتکاروں سے ملتا ہوں (مسکرا کر) نذرانہ وصول کرتا ہوں فصل کے حالات دریافت کرتا ہوں۔ ان سے پوچھتا ہوں کہ انہیں کسی بات کی شکایت تو نہیں ہے۔ جو کچھ انتظام یا رعایت وہ کرانا چاہتے ہیں، اس کا وعدہ کر لیتا ہوں لیکن (دوبارہ مسکرا کر) یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وعدہ آسان ہے وعدے کی وفا مشکل ہے! میرا اُصول ہے کہ زمیندار کو اپنی رعایا کے ساتھ خود نرمی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیئے تاکہ جب وہ اس سے ملیں تو اسے اپنا محسن اور دوست سمجھیں لگان کی وصولی وغیرہ میں جو کچھ سختی کرنی ضروری ہو اُسے کارندوں پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ میں نے مانا کہ سختی کے بغیر کام نہیں چلتا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ آجکل زمانہ نازک ہے، سختی اور نرمی کو ملا کر کام نکالنا چاہیئے اور بہترین تقسیم عمل یہی ہے کہ زمیندار خود نرمی سے کام لے اور اس کے کارندے سختی سے! کہیئے کیا رائے ہے؟"۔

شیخ صاحب کو یہ سُن کر یارائے ضبط نہ رہا۔ بولے "خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں آپ جیسے زمیندار موجود ہیں کیونکہ غریب کسانوں اور کاشتکاروں کی اصلاح اور بہبود کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ خدا زمینداروں کی عقل کو بالکل سلب اور معطل کر دے اور ان کے انسانی جذبات مفقود ہو جائیں اس وقت انشاء اللہ یہ نظام جو ظلم اور ناانصافی کی بنیاد پر قائم ہے، خود اپنی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ آپ ان جفاکش اور جفا نصیب کسانوں کی محنت میں سے اپنا حصہ "سختی اور نرمی کو ملا کر" وصول کر لیتے ہیں اور اس کے

برتنے پر عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ گراموفون بجاتے ہیں۔ شعر و شاعری کا لطف اٹھاتے ہیں سینما دیکھتے ہیں خوبصورت تصویروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ آپ ایک مہذب انسان ہیں! اور آپ کی طبیعت میں ماشاءاللہ نفاست اس قدر ہے کہ جب آپ گاؤں میں جا کر تفریح کرتے ہیں تو اس بات کا التزام رکھتے ہیں کہ وہاں کی غلاظت سے محفوظ رہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ لوگ جو بے زبان جانوروں کی طرح آپ کی خاطر اپنا پسینہ بہاتے ہیں سال میں ۳۶۵ دن اسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں! کبھی ان کے لئے بھی آپ نے صفائی یا حفظانِ صحت یا تعلیم کا کوئی بندوبست کیا؟ نہیں! آپ کو اپنے تہذیب اور تفریح کے مشاغل سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ یہ دردسری مول لیں! آپ نے کبھی اپنے ہاتھوں کو کسی کام یا مزدوری یا محنت سے آلودہ نہیں کیا، آپ کو ان کی زندگی اور قسمت کے لکھے کا کیوں اندازہ ہونے لگا؟

عاشق نہ شدی محنتِ ہجراں نہ کشیدی
کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ سراید"

مگر تہذیب اسے کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کی غضب آلود تقریر سن کر بھی میرے دوست کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ اسی اطمینان قلب اور شائستگی سے فرمانے لگے "شیخ صاحب۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف ایک ہی زندگی ملتی ہے، اسے بار بار تو

دنیا میں آنا نہیں ہے۔ اسی زندگی کو غنیمت جان کر اسے چاہئے کہ اس قلیل مدت میں یہاں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ علم حاصل کرے، دولت اور قوت حاصل کرے۔ اپنی ذہنی اور ذوقی قوتوں کی تربیت کرے، فطرت کے مناظر اور فنون لطیفہ کے شاہکاروں سے لطف اٹھائے۔ مختصر یہ کہ اپنی زندگی کو خوش باش طریقہ پر بسر کرے۔ اگر اسے تمام دنیا کی فکر پڑی رہے گی تو اس سے دنیا کو کچھ فائدہ نہ پہنچے گا اور وہ خود ہر طرح کی تہذیب اور تربیت سے محروم رہ جائے گا۔ دنیا میں واقعی ضرورت انفرادیت کو مستحکم کرنے کی ہے اگر ہر شخص اپنی اپنی فکر رکھے تو یہ نہ صرف اس کے لئے مفید ہی بلکہ سوسائٹی کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ آج کل لوگ جذبات کی تنگی اور دل کی کمزوری سے بے بس ہو کر بجائے اپنی ترقی اور اصلاح کی کوشش کرنے کے تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں، لیکن اس جذبات نوازی سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا معاف کیجئے گا، آپ کو میری باتیں شاید ناگوار گذریں۔ آپ غالباً خود غرضی کو برا سمجھتے ہیں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ خود غرضی ہی پر عالم کا نظام قائم ہے اور صحیح طور پر قائم ہے۔ اگر میں بھی جا کر گاؤں میں رہنے لگوں اور لوگوں کی طرح ہل چلاؤں اور بیلوں کی رکھوالی کروں تو دنیا میں ایک غلیظ جاہل بدمذاق کسان کا اضافہ ہو جائے گا اور (معاف کیجئے گا) ایک اچھے خاصے تعلیم یافتہ خوش مذاق، باتہذیب انسان کی کمی! ممکن ہے آپ اس تبدیلی کے لئے تیار ہوں

لیکن میں اس کو کسی طرح اچھا نہیں سمجھتا۔"

جب ہم لوگ وہاں سے نکلے تو شیخ صاحب کا چہرہ بہت غضب آلود تھا دروازے سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ بہت زور سے کہا:۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! ارے بھئی، تم نے مجھے کس نقلی انسان سے ملا دیا۔ یہ شخص زیادہ سے زیادہ ایک بہروپیا ہے یا ایک نمائش پسند جوان۔ کیا تم سنجیدگی سے یہ خیال کرتے ہو کہ اس شخص کو جو فنون لطیفہ سے سطحی دلچسپی رکھتا ہے اور خود غرضی کے فلسفے کی تلقین کرتا ہے تہذیب سے کوئی سروکار ہے؟ بیشک تہذیب نفس کی تکمیل کے لئے ذوق سلیم ایک نہایت ضروری چیز ہے، لیکن اتنا ہی جتنا کسی عمارت کے لئے خوبصورت اور موزوں ہونا۔ اگر عمارت ہی نہ ہو تو کس چیز کو خوبصورت بناؤ گے! اس کا خیال ہے کہ وہ فنون لطیفہ میں بہت دستگاہ رکھتا ہے، یہ سراسر غلطی ہے۔ جس شخص کو خدا کے بیشمار بندوں کے کام کاج اور محنت مزدوری سے کوئی سابقہ نہیں پڑا، جس کو کبھی دکھ اور مصیبت اور افلاس کی خلش محسوس نہیں ہوئی، جس نے کبھی انسانوں کے مشترک اغراض و مقاصد میں حصہ نہیں لیا، اس کو فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے خیالات اور نظریوں کی بنیاد الفاظ پر قائم رکھتا ہے جن کی حیثیت محض اتنی ہے کہ وہ ہوا میں تموج پیدا کرتے ہیں اور بس ان کی پشت پناہی کے لئے کوئی شدید اور پُرخلوص ذاتی تجربہ نہیں ہوتا

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک شاعر جو اپنی لافانی نظم سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے، محض خوبصورت الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے؟ نہیں، اس میں اس کے تلخ اور شیریں تجربات کا عطر ہوتا ہے، اس کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے، اس کے دل کے تار تمام انسانوں کے دکھ درد کے لئے لرزتے ہیں، اور ان کے ارتعاش کی وجہ سے اس کے الفاظ ہر شخص کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ جو شاعر ان تجربات کی دولت سے محروم ہے، جس کو خود غرضی نے تنگ حدود میں قید کر دیا ہے وہ ممکن ہے ایسے شعر کہہ دے جو کانوں کو بھلے معلوم ہوں اور عارضی طور پر دل کو لبھائیں لیکن وہ ہرگز کسی قدرِ مستقل کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اور یاد رکھو کہ شاعری سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے بھی وہی شرائط ہیں جو اچھا شعر کہنے کے، اور یہی حال تمام فنونِ لطیفہ کا ہے۔ ان سب کی بنیاد وہی محنت اور مزدوری اور دستکاری ہے جس کو آپ کا شاعر دوست حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور مجھے اس پر صرف یہی اعتراض نہیں کہ وہ فنونِ لطیفہ کی اہمیت کا غلط اندازہ کرتا ہے اور ان کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ یہ تو ضمنی بات ہے، مجھے تو اس کے تمام فلسفۂ حیات پر اعتراض اور اس سے اختلاف ہے۔ عزیزِ من۔ آج کل ہندوستان میں خاصی تعداد ایسے خوش پوش ذہین اور بظاہر خوش نصیب نوجوانوں کی ہے جن کو قدرت نے سوءِ اتفاق سے ہر قسم کے مواقع دیئے ہیں، آسودگی دی ہے دماغ اچھا دیا ہے، ان کی تعلیم مروجہ نظام کے مطابق بہت اعلیٰ پیمانے پر

ہوئی ہے۔ مگر وہ ہر لحاظ سے بالکل بیکار بلکہ باعث ضرر ہیں۔ بے کار اس لئے
کہ وہ کسی مفید تعمیری کام میں حصہ نہیں لیتے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے اغراض و مقاصد
میں اپنی ذاتی دلچسپیوں میں محصور رہنے کو مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ کسی عظیم الشان
اور سنجیدہ مقصد کے ساتھ خود کو وابستہ نہیں کرتے جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ ان کی انفرادی قوتوں کی نشو و نما بھی نہیں ہونے پاتی۔ کیونکہ کوئی شخص
اس وقت تک خود یابی کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ خود کو کسی اہم
مقصد کے اندر گم نہ کردے۔ وہ مضر اس لئے ہیں کہ دوسروں کے لئے ایک غلط
لیکن کشش رکھنے والی مثال قائم کرتے ہیں۔ وہ خود تہذیب کا مفہوم غلط سمجھتے
ہیں لیکن چونکہ اُن کی جماعتی حیثیت اچھی ہوتی ہے اس لئے ان کے خیالات کی
اشاعت ہو جاتی ہے اور قوم میں غلط قدروں اور غلط معیاروں کا رواج
ہو جاتا ہے۔ لوگ نمائشی اور سطحی چیزوں کو مستقل اہمیت رکھنے والی چیزوں پر
ترجیح دیتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے مفلس اور آسودہ حال تعلیم یافتہ اور جاہل
ہر قسم کے لوگ جھوٹے بتوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ میں اس قسم کے آدمیوں کو
انسان نہیں سمجھتا۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔"

ان کی یہ تمام باتیں سُن کر میں بہت گھبرایا۔ مگر میں نے یہ سوچا کہ شاید
اس قسم کی تہذیب کی وہ صحیح قدر نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے خود ان کی تربیت
بہت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی ہو۔ اس لئے میں انھیں یک خدا رسیدہ عالم کے

پاس لے گیا جن کے تقدس کی بہت دھوم تھی اور جن کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ محض اُن کے پاس بیٹھنے سے دل کی سیاہی کا فور ہو جاتی ہے اور ایمان چمک اُٹھتا ہے۔ یہ بزرگ عبا و قبا میں ملفوف ایک عالمانہ دستار سر پہ باندھے ایک تخت پر متمکن تھے۔ ان کے گرد کچھ فاصلے پر چند طلبا اور ملاقاتی مودب دوزانو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے نصیحت آمیز کلام پر سر تحسین ہلا ہلا کر بجا و درست کر رہے تھے۔ ہم نے بھی باادب سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ مولانا اس وقت دورِ حاضرہ کی بے دینی اور دہریت پر گفتگو فرما رہے تھے جس کا ماحصل یہ تھا کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے نوجوانوں کے دماغ میں آزادی کی مسموم ہوا سرایت کر گئی ہے۔ وہ مذہب اور اس کے عقائد و عبادات کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے ہیں، علمارِ دین کا کماحقہ احترام نہیں کرتے اور اگر یہی حالت قائم رہی تو کیا عجب ہے کہ پروردگارِ عالم ان پر اپنا قہر و غضب نازل فرمائے جیسا کہ اس نے امم سابقہ پر کیا تھا۔ اس خوفناک تہدید پر حاضرین نے مختلف انداز میں عبرت اور تاسف کا اظہار کیا اور ایک طالب حق نے یہ سوال کیا کہ "قبلہ و کعبہ اس عذابِ آلٰہی سے بچنے کا بھی کوئی طریقہ ہے یا نہیں۔ سرکار اپنی زبان مبارک سے کوئی ایسا عمل یا اسم تلقین فرمائیں جو حرزِ ایمان ہو اور ہم لوگوں کے خیالات کو راہِ راست سے بھٹکنے نہ دے۔" قبلہ و کعبہ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ مذہب سے توسل رکھتے ہیں

اُن کو چاہیئے کہ وہ ہر معاملے میں علمائے دین سے استصواب کریں اور اُن کے ارشاد کے مطابق عمل کریں اور اپنی کوتاہ عقل کو ہر جگہ دخل نہ دیں میں تمہیں ایک دعا بھی لکھ دوں گا لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ لوگ خلوص سے عبادت گذاری کریں، اور خوفِ خدا ہر وقت اپنے دل میں رکھیں لیکن (یہاں پہنچ کر اُن کی آواز میں رعب و جلال کی شان پیدا ہو گئی) وہ عاقبت ناشناس لوگ جنھوں نے اپنے دلوں میں شکوک کو جگہ دی ہے وہ خدا اور محافظین شریعت کے احکام پر بے چون و چرا عمل نہیں کرتے اور ہر بات کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں، ان کے لئے حکم الٰہی بالکل صریح ہے "فجزاء ھم جھنم خالدین فیھا" بخدائے عزوجل، اگر دنیا میں علمائے دین کا وجود نہ ہوتا جن کی مثال انبیائے بنی اسرائیل کی ہے، تو یقیناً اس امتِ ناہنجار پر قہر الٰہی نازل ہو چکا ہوتا۔

اس ارشاد کو سُن کر تمام حاضرین پر بالکل سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کو اس وقت صریحاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان سے یہ چند بابرکت ذاتیں اُٹھ جائیں تو دنیا کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ اس خموشی کو میرے ساتھی نے نہایت دھیمے اور مؤدب لہجے میں یہ کہہ کر توڑا "مولانا! جناب نے یہ تو بالکل درست ارشاد فرمایا کہ آج کل لوگوں میں بے دینی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی زبان معجز بیان سے اتنا اور ارشاد فرما دیجئے کہ بے دینی کی

اس روز افزوں اشاعت کی وجہ کیا ہے اور علماء دین کی مقتدر جماعت کے ہوتے ہوئے اس کا تدارک کیوں نہیں ہو سکتا؟" مولانا نے ذرا چونک کر ان کی طرف دیکھا کیونکہ ان کو ایسے لوگوں سے بالعموم سابقہ نہ پڑتا تھا جو اس قسم کے سوالات ان سے کریں۔ انھوں نے کہا "حضرت میں نے ابھی تو بیان کیا تھا کہ مروجہ بے دینی کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ان کے خیالات کو خراب کر دیا ہے۔ شک کی لعنت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ علماء دین کی عزت اور ان کے مرتبے کو نہیں پہچانتے اس لئے وہ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے اور جہالت و ضلالت کے سمندر میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ جب خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ اور مصلحت غالبہ سے ان کے دلوں کو حق کی جانب پھیر دے گا اور وہ ہماری طرف رجوع کریں گے اس وقت انشاء اللہ المستعان ہم ان کی ہدایت کا انتظام کر سکیں گے۔

یہ بات سن کر بجائے خاموش ہو جانے کے شیخ صاحب کج بحثی پر اتر آئے اور بولے "مولانا! معاف کیجئے گا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر خداوند عالم از خود اپنی حکمت کاملہ سے ان نوجوانوں کے دلوں کو حق کی طرف پھیر دے گا تو اُس وقت آپ کی ہدایت کی کیا ضرورت رہے گی۔ کیا ہدایت الٰہی کے بعد بھی کسی انسانی ہدایت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ میری رائے ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف

وسیلوں اور واسطوں سے کام لیتا ہے اور خود جناب نے ابھی ارشاد فرمایا تھا کہ امت کی ہدایت اور نجات کا وسیلہ علمار دین کی جماعت ہے۔ اس لحاظ سے تو جناب پر یہ فرض عائد ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں اور ان کو راہ راست پر لانے کی تدابیر سوچیں، ورنہ محض ہادی ہونے کا دعوٰی کرنا کافی نہیں۔"

مولانا کو شیخ کی یہ گستاخی اور آزادی رائے ناگوار گذری لیکن انھوں نے تحمل سے کام لے کر فرمایا "حضرت میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ لا تجسّسوا فی امور اللہ" جن معاملات کو انسان نہیں سمجھ سکتا ان میں اسے اپنی عقل نہیں لڑانی چاہیے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ خدائے عزوجل کے احکام اور مصلحت کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں؟ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم احکام الٰہی اور ان کے مفہوم ومعانی کو آپ تک پہنچائیں، اور آپ کا فرض ہے کہ آپ ہماری تعمیل کریں، اور ہدایت وضلالت کے مسئلہ پر رائے زنی نہ کریں وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ضلالت کی طرف لے جاتا ہے۔"

یہ حکم قاطع سن کر ہمارے شیخ صاحب کا تحمل ختم ہوگیا اور انھوں نے اپنے مؤدب لہجہ اور دھیمی آواز کو خیرباد کہہ کر ایک پُرزور تقریر کر ڈالی۔ فرمانے لگے:۔

"جناب! آپ لوگوں کی عادت ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ہر مسئلہ پر ایک

حکم قطعی لگا دیتے ہیں اور اس کی تائید میں کوئی غیر متعلق آیت اور اگر آیت دستیاب نہ ہو تو کوئی عربی جملہ سُنا دیتے ہیں اور اس طرح آزادی رائے اور اظہار خیال کا سدّ باب کر دیتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں مذہب پر ایمان رکھنے کے معنے ہیں آنکھیں بند کر لینا! میں سمجھتا ہوں کہ اس کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ عقل کی آنکھیں کھول ڈالو اور ضرور ہر معاملہ میں تلاش، جستجو، طلب حق کرو ختم رسل کے بعد وحی و الہام کا دروازہ بند ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب انسان اپنی عقل اور فکر کے دروازے کھول ڈالے لیکن آپ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے جس قدر باتیں بیان فرمائیں سب غلط ہیں (اس پر اِدھر اُدھر کے لوگوں نے کچھ اظہار ملامت کرنا چاہا لیکن وہ شیخ صاحب کی تقریر کے دھارے کو روک نہ سکے) اسلام نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ انسان اپنی عقل اور رائے کو معطل کر دے اور اپنے تمام شکوک و شبہات کا گلہ گھونٹ دے۔ آزادی رائے انسان کا سب سے زیادہ قابل قدر حق ہے اور عقل خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ جب انسان ان سے دستبردار ہو گیا تو اس کے پاس رہ کیا جائے گا؟ رہا شکوک کا پیدا ہونا سو یہ فطرت کا مقتضیٰ ہے۔ اگر ان کی تشفی نہ کی جائے بلکہ عذاب الٰہی اور اس سے بھی کہیں زیادہ علماء دین کے غیظ و غضب سے ڈرا کر انھیں دبا دیا جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ روحانی ہلاکت ہوتا ہے۔ ایک سچے اور فطرت شناس عالم کا

تو یہ فرض ہے کہ وہ نوجوانوں کے شکوک کی پذیرائی کرے، ان کو کرید کرید کر معلوم کرے اور اپنے زیادہ گہرے اور ہمہ گیر علم کی مدد سے ان کی تشفی کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ ان کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں، اس لئے وہ مذہب اور علمائے دین کی طرف سے بے اعتنائی اور روگردانی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ چونکہ آپ ان کے شکوک کی تشفی نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے اس لئے وہ آپ کی طرف سے بدظن ہیں۔ آپ نے مذہب کو بالکل ایک طلسم یا بھول بھلیاں بنا رکھا ہے اور اس میں چاروں طرف نہایت خوفناک اوامر اور نواہی کھڑے کر دیئے ہیں۔ تاکہ کسی شخص کو جو شروع ہی سے ہر معاملہ میں پوری طرح ہار نہ مان لے اس کے قریب پھٹکنے کی ہمت نہ ہو۔ آپ صرف ان لوگوں کے ساتھ سروکار رکھنا چاہتے ہیں جو ہر بات میں ہاتھ باندھ کر بجا و درست کہیں اور کبھی اختلاف رائے کی جرأت نہ کریں۔ پھر آپ کو دوسرے لوگوں سے یہ شکایت کیوں ہے، کہ وہ آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے آپ نے کبھی اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ان کی مشکلات کے ساتھ ہمدردی نہیں کی، کبھی دورِ حاضرہ کے تمدنی مسائل پر غور کر کے اصول و قوانین کو ان پر منطبق نہیں کیا۔ آپ نے تمام تمدنی انقلابات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، تمام جدید مطالباتِ حیات کی طرف سے رُوگردانی کر کے چند الفاظ اور علامات، اور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے پر قناعت

کی۔ آپ مذہب کی خدمت کے معنیٰ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے مکان پر عزت اور آرام اور کم وبیش آسودگی کی زندگی بسر کریں۔ کبھی کبھی نماز پڑھا دیا کریں، آپ سے جو مسئلہ پوچھا جائے اس کے متعلق اپنا فتویٰ دے دیں اور اگر کوئی شخص آپ سے اختلاف کرے تو اس کو کافر قرار دیں۔ اگر کوئی جدید تحریک شروع ہوتی ہے جس میں پہلے سے آپ کی رائے نہ لی جائے اور جس کا افتتاح آپ کے متبرک ہاتھوں سے نہ ہو تو آپ اس کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کرتے ہیں آپ خود دنیاوی جاہ وعزت اور آسائشوں سے کنارہ کش نہیں ہوتے لیکن آپ کی زبانی تلقین و تعلیم یہی ہے کہ دین اور دنیا دو مختلف چیزیں ہیں اور دنیاوی مفاد کے لئے جدوجہد کرنا گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص مذہب کے ظاہری ارکان کو پورا کرتا ہے لیکن معاملات میں بددیانت اور ناانصاف ہو تو اس کی گرفت کرنا آپ اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ انسانوں کی زندگی نوے فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ دنیوی معاملات اور کاروبار کی زندگی ہے اس کی اصلاح کرنا اس کو اصول عدالت کے ماتحت منظم کرنا آپ کا اصلی فرض تھا۔ لیکن آپ ان کی زندگی کے دس فی صدی حصے پر قانع ہو گئے ہیں اور اس میں بھی آپ نے مذہب کو، جو ابتدا میں ترقی اور ہمت اور حوصلہ کا ضامن تھا، جمود اور قدامت پرستی کا مرادف بنا دیا ہے۔ آپ سے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اپنے مقام معزز کو چھوڑ کر اٹھیں، خدا کی دنیا اور خدا کے بندوں

میں گھومیں پھریں۔ ان سے ملیں جُلیں، افلاس، جہالت، توہم پرستی، بیماری اور ظلم و نا انصافی کے دردناک مناظر کو دیکھیں اور انھیں دور کرنے کے لئے اپنا پسینہ بہائیں، لباس، انداز گفتگو اور "شانِ علم" میں عزت نہیں، عزت تو خدمت میں ہے۔ لیکن خدمت سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ کیا آپ کے اور ہمارے ہادی اور سردار سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ نے اشاعتِ دین اور اعلاء کلمۃ الحق کا فرض اسی طرح انجام دیا تھا جس طرح آپ انجام دیتے ہیں یعنی کیا وہ اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہتے تھے اور جس کسی کو فقہ اور شریعت کے مسائل دریافت کرنے ہوتے وہ خود حاضرِ خدمت ہوتا۔ اور مسئلہ پوچھ کر چلا جاتا تھا؟ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو کیا انھیں وہ عظیم الشان کامیابی ہوسکتی تھی جو ہوئی؟ ہرگز نہیں انھوں نے چالیس برس کی عمر تک بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ لوگوں کی خدمت کی۔ غریبوں، مظلوموں، بیماروں، محتاجوں، بیکسوں اور کمزوروں کی دادرسی کی، ان کی خاطر مزدوروں کی طرح کام کیا اور اپنی شانِ امانت کا سکّہ دوست دشمن سب کے دلوں پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ہر طرح کے خطروں اور آزمائشوں کو جھیل کر خدا کا پیغام ہر جگہ سُنایا۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں، اٹھانی پڑیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ جب کوئی شخص اخلاقِ محمدی کا خفیف سا پرتو اپنی ذات میں پیدا کرے، جب وہ اپنے نفس کو زیر کرکے

دوسروں کے رنج وراحت کو اپنی ذاتی آسائش اور آرام پر ترجیح دینے لگے جب وہ سچ کی خاطر ہر قسم کی تحریص وترغیب کو ٹھکرا دے، جب وہ سردار بننے کی بجائے خادم بننے کی کوشش کرے، اس وقت علماء امتی' میں سے ہونے کا دعویٰ کرے ورنہ ایک وضع خاص بنا کر "شان علم" پیدا کر لینی کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جناب مولانا! آپ میری گستاخی کو معاف کر دیجئے مگر میرے الفاظ پر غور کیجئے۔ یہ نہ دیکھئے کہ کون شخص یہ باتیں کہہ رہا ہے بلکہ یہ سوچئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اپنی شانِ تقدس، اپنے ادّعائے بزرگی کو خدا حافظ کہئے خداوند عزوجل کی بارگاہ میں انسانوں کا ایک دوسرے پر تفوق جتانا اور خود کو مافوق البشر سمجھنا نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو واقعہ دین کی حمایت مقصود ہے اور آپ بے دینی کے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو دوسرے انسانوں کی طرح انسان بن جائیے اور ان میں مل جُل کر، ان کے درمیان رہ کر ان کی خدمت کیجئے۔ آزاد خیالی اور مغربی تہذیب وتمدن پر الزام رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر آپ کو اجتہاد کا دعویٰ ہے تو اسلام کی تعلیم کو ایسے انداز میں پیش کیجئے کہ وہ موجودہ تہذیب وتمدن کو کلیتہً مسترد نہ کرے بلکہ اس کے بہترین عناصر کو اپنے اندر ضم کر لے اور لوگوں کے فلاح دارین کا باعث ہو یعنی ان کے دین اور دنیا دونوں کو سدھارے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ سے عیسائی مشنری بہتر ہیں جو مدرسے

کھولتے ہیں، دوا خانے جاری کرتے ہیں، لوگوں کو صفائی اور حفظان صحت کے اصول سکھاتے ہیں غریبوں سے ملتے جلتے ہیں، ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے، ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کی مذہبی تلقین غلط سہی ممکن ہے ان کی نیت مشکوک ہو لیکن ان کی معاشرتی خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر بہت تیزی کے ساتھ مکان سے باہر نکل گئے قبل اس کے کہ مولانا ان کو عذاب الیم کی بشارت دیں اور حاضرین مجلس جن پر حیرت اور غصہ دونوں طاری تھے ان کی اچھی طرح خبر لیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب میرے ہوش وحواس ذرا ٹھکانے ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ "حضرت آپ برائے خدا اس قسم کی حرکتیں نہ کیجئے ورنہ آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی"۔ انھوں نے کہا کہ "تم ان ذرا ذرا سی باتوں کا خیال نہ کرو ایسے مواقع تو مجھے آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ انسان کی تلاش جان جوکھوں کا کام ہے پھولوں کی سیج نہیں"۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جی ہاں، خصوصاً ایسی حالت میں جب اس میں بت شکنی کا فرض بھی شامل ہو۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ کو ان صاحب سے کہاں کی دشمنی تھی کہ آپ نے ان کی اس بری طرح لے دے کر ڈالی اور ان کی بزرگی اور مرتبے کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔

ان مولوی صاحب کی علمی معلومات بہت وسیع ہیں، وہ ہر شخص سے اخلاق اور مروّت سے پیش آتے ہیں۔ عبادت گذار ہیں بہت پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوائے اس قلیل نذرانے کے جوان کے بعض معتقد از خود پیش کر دیتے ہیں اور وہ بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا ہے ان کا اور کوئی وسیلۂ معاش نہیں لیکن وہ اسی پر قانع ہیں۔ اگر علمیت اور اخلاق، عبادت اور قناعت نیک نفسی اور مرنجان مرنج تہذیب اور انسانیت کے اجزا نہیں ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انسانیت سے کیا مراد لیتے ہیں؟"

انھوں نے کہا" عزیزمن تمہاری نظر سطحی خوبیوں سے خیرہ ہو جاتی ہے اول تو تم نے جس قدر صفات گنائی ہیں ان کا مفہوم میرے نزدیک وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ دوسرے ان صفات کو تہذیب و انسانیت سے کوئی لازمی تعلق نہیں، مجھے جس انسان کی تلاش ہے اس کے لئے عالم ہونا، لوگوں سے اخلاق و مروت برتنا اور عبادت گذاری کرنا لازم نہیں۔ میں تو عالم دین بھی ایسا چاہتا ہوں جس کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کا دامن تقدس عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کے دکھ درد ان کے مشاغل میں شرکت کرنے سے آلودہ ہو جائے گا۔ جو انسان بن کر رہے خود کو حیوانوں میں فرشتہ نہ سمجھے جو محض "گلیم خویش" کو بچا کر لے جانے کی فکر نہ کرے بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لئے جدوجہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہو۔ مجھے خاص کر کے ان مولوی صاحب کے

متعلق نہ کوئی علم ہے نہ ان سے کوئی ذاتی پرخاش یا شکایت، ممکن ہے وہ اپنی ذات سے بہت اچھے اور نیک آدمی ہوں، اس معنی میں جو اچھے اور نیک کے عرف عام میں سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی مختصر سی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ انھوں نے ابھی مذہب کی الف بے کو بھی نہیں سمجھا۔ میں اس طبقہ علماء کے بہت سے افراد کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنی علمیت اور تقدس کو گویا ایک لبادہ بنا کر اپنے گرد لپیٹ لیا ہے اور دنیا کی جدوجہد اور تگ و دو، اس کی تکلیفوں اور تحریصوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ان کی عبا و قبا کو اس علیحدگی کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ یاد رکھو مذہب کو زیادہ نقصان ان لوگوں سے پہنچتا ہے جو بظاہر اس کے محافظ اور حامل ہیں لیکن روح مذہب تک نہیں پہنچتے ہیں اور نیک نیتی کے ساتھ لوگوں کو گمراہ یا بددل کرتے ہیں۔ لوگ ان کو اپنا راہنما مانتے ہیں۔ ان کے افعال و اقوال کو اپنے لئے سند بنا لیتے ہیں اور اس طرح رہبر اور راہرو دونوں نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس راستے پر پڑ لیتے ہیں جو ان کو منزل مقصود سے بالکل مخالف سمت میں لے جاتا ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است"

ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید ان کو مذہبی لوگوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ طبعاً ان کے مخالف ہیں۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ انھیں ایک ایسے صاحب سے ملاؤں جن میں صرف وہ خوبیاں ہیں جو بقول

شیخ صاحب نظر کو خیرہ کرتی ہیں بلکہ وہ صفات بھی ہیں جن کے وہ خود قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں انھیں اس مرتبہ ایک نہایت مشہور اور ممتاز بیرسٹر کے پاس لے گیا جنھوں نے تعلیم جدید کے اعلیٰ ترین منازل کی تکمیل کی ہے۔ ان کی علمی اور انتظامی قابلیت، ان کی ایمانداری، ان کی اقبال مندی کا تمام ملک میں شہرہ ہے۔ اور قوم و حکومت دونوں کی نظر میں ان کی بہت قدر اور عزت ہے۔ ان کی رائے ہر معاملے میں نہایت وقیع اور ذمہ دار سمجھی جاتی ہے، وہ اکثر قومی تحریکوں کے رکن بلکہ سرگروہ ہیں، پبلک جلسوں تعلیمی اور معاشرتی انجمنوں کے صدر منتخب ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کو ایسی قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ محض ان کی موجودگی سے جلسے کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور ان کی صدارت سے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان کو خدا نے دولت علم کے ساتھ دولت دنیا کی نعمت بھی دی ہے جس میں سے ایک کافی حصہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ قومی تحریکوں اور طلبار کی امداد پر صرف کرتے ہیں۔ بہر حال بحیثیت مجموعی وہ قوم کے ایک نہایت مفید، معزز اور سرگرم رکن ہیں۔ بیرسٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت تپاک سے ملے اور تھوڑی سی تمہیدی گفتگو کے بعد انھوں نے پوچھا کہ "فرمایئے آپ کو ملک کے موجودہ سیاسی معاملات سے بھی کوئی دلچسپی ہے یا نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں اخبار تو دیکھتا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ

یہ گتھی کیسے سلجھے گی" کہنے لگے" اب تو معاملات بالکل سُلجھ گئے ہیں ہندوستان کا سیاسی مستقبل روز روشن کی طرح واضح ہے۔ ہمیں بہت جلد فیڈرل حکومت مل جائے گی۔ اسمبلی اور کونسلیں اپنی ہوں گی۔ آپ لوگوں کو جو نوجوان اور تعلیم یافتہ ہیں (میں نے دل میں سوچا کہ میرے ساتھی کو تو دونوں باتوں سے انکار ہے وہ نہ نوجوان ہیں نہ تعلیم یافتہ!) چاہیئے کہ ان جدید مواقع سے فائدہ اُٹھائیں اور کونسلوں میں جاکر قومی خدمت کریں اور اپنے مفاد کا تحفظ کریں۔ آج کل سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں کونسلوں پر مزدوروں کا، اچھوتوں کا کانگریس وغیرہ کا قبضہ نہ ہو جائے۔ یہ لوگ یا تو اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں یا ان میں قدرتاً یہ صلاحیت نہیں کہ وہ سیاسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام زمیندار سرمایہ دار اور معقول خیالات کے تعلیم یافتہ لوگ مل جُل کر ایک ایسا مکمل نظام قائم کریں کہ ملک کی حکومت ان کے ہاتھوں میں آجائے اور انھی کے ہاتھوں میں رہے ورنہ بہت بدامنی اور نقصان کا اندیشہ ہے۔"

بیرسٹر صاحب کے لہجے اور انداز گفتگو میں یقین اور اطمینان کی ایسی شان پائی جاتی تھی کہ اگر کوئی شک یا شبہ کسی کج فہم کے ذہن میں پیدا بھی ہوتا تو وہ شرم کے مارے فوراً دور ہو جاتا۔ لیکن شیخ صاحب عجیب آدمی نکلے، کہنے لگے:۔

"جناب من! آپ کو یہ فکر کیوں لگی ہوئی ہے کہ حکومت دولت مندوں اور

اور زمینداروں کے ہاتھ میں رہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ جمہوری حکومت یا ذمہ دارانہ حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت میں سب لوگوں کا حصہ ہو۔ سب اس میں شریک ہوں اور اس کا نظام ایسا قائم کریں کہ سب کے مفاد کی حفاظت ہو، ۔۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بیرسٹر صاحب بیچ میں بول اٹھے۔ ان کی ذہنی تیزی اور جودت کی ایک علامت بلکہ ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بہت کم سنتے ہیں اور اپنے خیال کو بہت سرعت کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ کہنے لگے (اور ان کے لہجے میں بے انتہا وثوق تھا کچھ تمسخر کی چاشنی تھی اور کچھ وہ رحم اور ہمدردی جو ہر جاننے والے بیوقوفوں یا جاہلوں کی باتوں پر ہوتی ہے) "جی ہاں میں نے بھی کتابوں میں اس قسم کی باتیں پڑھی ہیں اور پلیٹ فارم پر تقریر کرنے والے بھی اس قسم کے دلفریب خیالات ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں لیکن ہم آپ جو تسلیم یافتہ اور سمجھ دار ہیں اور جن پر سوشلزم وغیرہ کے خراب اور خطرناک خیالات کا اثر نہیں ہوا اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے ملک میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بے انتہا دولت لگی ہوئی ہے، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت کا نظام انھی کی وجہ سے قائم ہے اگر وہ اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت نہیں کریں گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ غیر ذمہ دار لوگ اور جماعتیں ملک کے بنے بنائے نظام کو درہم برہم

کردیں گے اور ایسے قوانین بنائیں گے کہ ہم لوگوں کی پوزیشن اور حقوق خطرے میں پڑجائیں گے کیا آپ اس خوفناک انجام کی پذیرائی کرنے کے لئے تیار ہیں؟ جناب! عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان عملی دنیا میں عملی قوانین کی پابندی کرے، خیالی اور ہوائی باتوں پر اپنے قلعے کی بنیاد نہ رکھے!"

شیخ صاحب کو پھر تردید کے مرض نے مجبور کیا اور بولے "جی ہاں! میں تو بہت خوشی سے اس خوفناک انجام کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہوں جس سے آپ خود ڈرتے ہیں اور دوسروں کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ ڈر انھی پر طاری ہوتا ہے جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور ان تمام جماعتوں کے دل میں چور ہے جن کی آپ نیابت کرتے ہیں۔ آخر سرمایہ داروں کے پاس سرمایہ کہاں سے آیا؟ انھی غریبوں اور مزدوروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے نا! جن کو آپ ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ آپ لوگوں نے کونسلوں اور حکومت کے نظام پر قبضہ کر کے ایسے قوانین بنا دیئے ہیں جن کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ آپ کے غصب کردہ حقوق اور آسائشوں کی حفاظت کریں اور خدا کے بے شمار بندوں کو اقل ترین انسانی حقوق سے محروم رکھیں۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے اور کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ لوگ تو دنیا کی تمام نعمتوں پر قابض ہو کر بیٹھ جائیں اور عیش و فرصت کی زندگی بسر کریں۔ اور باقی تمام نوع انسانی کے حصے میں

محنت اور مصیبت آئے نہ اُنھیں پیٹ بھر کھانا نصیب ہو نہ تن ڈھانک کپڑا۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی جدید حکومت کہیں ایسے قوانین نہ بنائے جن سے آپ کے مفاد کو نقصان پہونچنے کا امکان ہو۔ میں کہتا ہوں کہ دیر یا سویر ایسا ہونا اٹل ہے۔ آپ سیلاب کی یورش کو کچی مٹی کے گھروندوں سے نہیں روک سکتے۔ آج کل تمام دنیا کا یہی رجحان ہے کہ قانون سازی سوشلزم کے اصولوں پر کی جائے۔ میں خود سوشلزم کا زیادہ قائل نہیں مجھے اس کی بعض باتوں سے اختلاف ہے۔ لیکن آپ کو اس سے کسی طرح مفر نہیں ملے گا۔ خود انگلستان میں جو سب سے زیادہ قدامت پسند ملک ہے اور جس کو آپ ہر معاملے میں اپنا نمونہ اور مطمح نظر سمجھتے ہیں، پارلیمنٹ برابر ایسے ہی قوانین بنا رہی ہے جو دولت اور سیاسی قوت کی تقسیم انصاف اور مساوات کے اصولوں پر کریں۔ عام اس سے کہ حکومت قدامت پسندوں کی ہے یا مزدوروں کی وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ آپ کب تک اپنے ملک میں شیشے کے گھر بنا کر رہنا چاہتے ہیں؟ اور شیشہ بھی ایسا نازک کہ اگر کوئی ذراسی کنکری بھی اٹھا کر پھینکے تو سارا امکان چکنا چور ہو جائے۔ رہے آپ کے زمیندار اور ان کی تعظیم، سو اس کا خدا کے فضل سے کوئی اندیشہ ہی نہیں ا کبھی آپ نے آج تک یہ دیکھا ہے کہ مردہ گھوڑے چابک کی مار سے دوڑے ہوں؟ آخر ان کے سامنے کونسا ایسا ولولہ پیدا کرنے والا النصب العین ہے،

کونسا مطمح نظر ہے جوان میں نئی روح پھونکے گا؟ روپے کی تھیلیوں کی حفاظت؟ ایک طرف تو غلط یا صحیح، عوام الناس کے سامنے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنانے کا نصب العین پیش کیا جا رہا ہے جو انھیں ایثار اور قربانی کا جوش دلاتا ہے اور دوسری طرف آپ ان مردہ ڈھانچوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی چوری کے مال کی حفاظت کریں! بیرسٹر صاحب! آپ تو ایک ایسی لڑائی لڑ رہے ہیں جس میں آپ کی شکست یقینی ہے ۔ ۔ ۔"

بیرسٹر صاحب اس تقریر کے دوران میں بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے اور انھوں نے کئی مرتبہ شیخ صاحب کی بات کاٹنا چاہی لیکن یہ چوکتے ہو چکے تھے اور اُن کو اس کا موقع نہیں ملا۔ اب جو وہ بتقاضائے عمر سانس لینے کے لئے رُکے تو بیرسٹر صاحب نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور فوراً میدانِ جنگ میں کود پڑے "جناب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ اِس سن و سال آپ کے خیالات اس قدر مہمل اور خراب ہیں اور آپ کے دماغ پر روس مسلط ہے! آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ آپ کے اس پسندیدہ ملک میں لوگوں کی حالت کیا ہے (میں یہ سُن کر تعجب سے ان کا منہ دیکھنے لگا کیونکہ شیخ صاحب نے تو روس کا نام تک نہیں لیا تھا) وہاں نہ مذہب باقی رہا ہے، نہ اخلاق نہ آزادی، نہ حیا، نہ غیرت، انسان مشین کے غلام بن گئے ہیں۔ کسی کو اپنی انفرادیت اپنی مخصوص قابلیت کو تربیت کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کا مقصد زندگی صرف اتنا ہی ہے

کہ وہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ چیزیں پیدا کریں اور دنیا کے بازاروں میں ان کا ڈھیر لگا دیں اور اپنے فاسد خیالات کی اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کریں ملن کی حماقت کا یہ حال ہے کہ وہ انسانوں میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں جو فطرت انسانی اور مصلحت الٰہی دونوں کے خلاف ہے جب دنیا میں تمام لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جب دو آدمی بھی ایسے دستیاب نہیں ہو سکتے جن کی دماغی قابلیتیں ایک سی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں زبردستی مساوات قائم کر دی جائے یا سب کی مالی حیثیت ایک سی ہو جائے کیا کسی سلیم العقل انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ ایک جج یا وزیر کو وہی مشاہرہ دیا جائے جو ایک خاکروب یا مالی کو ملتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو لوگوں کو کام کرنے کی، محنت کرنے کی کیا تحریص رہے گی؟ انھیں کام سے دلچسپی کیوں ہو گی؟ یہ تو انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ ممکن ہے آپ جیسے چند لوگ ایسے نکل آئیں جن میں روحانیت اس درجہ بھری ہوئی ہو کہ وہ اس مضحکہ خیز صورت حال پر قانع ہو جائیں لیکن عام لوگ جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ ان باتوں سے آپ یہ مطلب نہ نکالیے گا کہ میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا یا ان کی مدد نہیں کرنا چاہتا مجھے ان کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مزدوروں کو اپنی محنت کا مناسب معاوضہ ملے اور فقیروں، محتاجوں، بے وسیلہ لوگوں

سے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔ ہمارے مذہب نے خیرات کرنے کا حکم دیا ہے اس کو پورا کرنا چاہیئے۔ زمینداروں کو کاشتکاروں اور مزدوروں کے ساتھ مہربانی اور رعایت کا برتاؤ کرنا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے امتیازات کو پس پشت ڈال دیں۔ اور عقل و مصلحت کو فراموش کرکے ایک ناممکن العمل آئیڈیل کے پیچھے سرگرداں رہیں۔ . . . . اچھا معاف کیجئے گا مجھے اس وقت ایک جلسے میں جانا ہے خدا حافظ۔ پھر ملاقات ہوگی" بیرسٹر صاحب مقدمہ جیت کر رخصت ہوئے اور مجھے شیخ صاحب کے طوفان تکلم میں گرفتار چھوڑ گئے۔ کچھ تو خیالات کا ہجوم کچھ اس ترک کی خفگی کہ انھیں بیرسٹر صاحب کو قائل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا باہر نکلتے ہی مجھ پر برس پڑے :-

"کیوں صاحب آپ کو انھی حضرت کی ذات اور صفات پر ناز تھا ؟ انھی کو آپ انسان کامل سمجھتے ہیں؟ آخر آپ کس چیز سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہیں؟ شہرت سے؟ وہ تو ہر قسم کے لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اکثر ایسی تدبیریں اور وسیلے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی طرف واقعی ایک شریف آدمی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ ہوگا۔ دولت سے؟ میں دولت کو فی نفسہ برا نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دولت کی طمع میں لوگ جس قدر ذلیل حرکات اور ظلم کرتے ہیں اتنا اور

کسی وجہ سے نہیں کرتے اور میں نے ایک بہت بڑے بزرگ کا یہ قول بھی سُنا ہے کہ کوئی امیر آدمی اس وقت تک آسمانی حکومت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذر جائے۔ دماغی قابلیت سے؟ بے شک عقل اور ذہانت خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے لیکن جو شخص اس کو محض اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے اور اس کے ذریعہ بندگانِ خدا کی خدمت نہ کرے وہ مجرم ہے اور کفرانِ نعمت کا مرتکب۔ عزیز من تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات لوگ باوجود ہر قسم کی قابلیت اور مواقع میسر ہونے کے دنیا میں کوئی مفید اور دیرپا کام نہیں کر سکتے اور باوجود بہت بڑے آدمی ہونے کے درحقیقت بہت چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ جانتے ہو اس کا سبب کیا ہے! اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کے جن میں تمہارے ممدوح کا شمار بھی ہے، دل اور دماغ دونوں بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور آدمی میں یہ سب سے بڑی المناک کمی ہے۔ انسانیت وسعت چاہتی ہے۔ دل کی وسعت، دماغ کی وسعت، نظر کی وسعت۔ ایسا دل جس میں علاوہ اپنے دُکھ درد کے دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے، ایسا دماغ جس میں اپنی مخصوص دلچسپیوں اور مشاغل کے علاوہ دوسروں کے نقطۂ نظر اور اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو، جو دوسروں کی رائے اور خیالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے ایسی نظر جس پر گھوڑے کی طرح اندھیریاں نہ لگی ہوں، جو دائیں بائیں

آگے پیچھے ہر طرف دیکھ سکے، جس کو نہ صرف اپنے گرد و پیش کی چیزیں اور اپنی
فوری ضروریات اصلی معلوم ہوں۔ بلکہ مستقبل کے امکانات بھی اس کے لئے
ایسی ہی اہمیت رکھتے ہوں، جو ہر نصب العین کو محض اس وجہ سے مسترد نہ کر دے
کہ وہ اس کو نظر نہیں آتا۔ ہر قسم کی تنگی اور تنگ نظری تہذیب اور انسانیت
کے منافی ہے لیکن ان لوگوں کے نہ دل میں وسعت ہے نہ دماغ میں نہ نظر
میں۔ ان میں نہ رواداری ہے نہ دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت۔ جو
خیال ایک دفعہ ان کے ذہن میں آجاتا ہے اسی کو صحیح سمجھتے ہیں خواہ
دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں ان کے دماغ میں کبھی یہ تکلیف دہ مگر جو ان کو
انسان بنانے والا خیال نہیں گذرتا کہ ممکن ہے وہ کسی معاملے میں غلطی پر
ہوں۔ تم نے فطرت انسانی کے متعلق اس بڑے آدمی کے خیالات کو سنا اور لطف
یہ ہے کہ اگر میں کئی روز تک مسلسل اس شخص سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتا جب
بھی اس کے خیالات میں کوئی فرق نہ آتا بلکہ وہ مجھے مجنوں سمجھ کر چھوڑ دیتا
اور اپنے خیالات میں اور پختہ ہو جاتا۔ ہر معاملہ میں اس کے خیالات بالکل
سطحی ہیں۔ افلاس کے مسئلہ پر ارشاد ہوا تھا کہ میں اس بات کے لئے آمادہ
ہوں کہ ہم خیرات کے طور پر اپنے دستر خوان کے ٹکڑے غریبوں کے سامنے
جھاڑ دیں لیکن وہ اس خیال کو جنون کی علامت سمجھتا ہے کہ افلاس کو دور
کر لے اور دولت کی بہتر تقسیم کرنے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کئے جائیں۔

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ غلاظت کو جہاں تک ہو سکے چھپانے کی کوشش کرو دور کرنے کی فکر نہ کرو کپڑا پھٹے تو اُس کو بدلو نہیں پیوند پر پیوند لگاتے جاؤ کیونکہ اس مفکر اعظم کے خیال میں ہر قسم کی بنیادی اور دور رس تبدیلی انقلاب ہے اور انقلاب مصلحت آلہی کی مخالفت! اس کے نزدیک قانون اور انصاف بالکل ایک ہی چیز ہیں اور اگر کوئی شخص انصاف کی حمایت میں قانون کو بدلنا چاہے یا اس کی مخالفت کرے تو اخلاقی اور قانونی مجرم ہے۔ وہ ان محتاط لوگوں کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس نے دو ہزار برس ہوئے حضرت عیسیٰؑ کو اس لئے پھانسی دے دی تھی کہ ان کی تعلیم مروجہ خیالات اور عقائد کے خلاف تھی۔ جو چودہ سو برس ہوئے پیغمبر اسلام کی مخالفت پر اس لئے کمر بستہ تھے کہ وہ عدل اور مساوات اور اخوت کا انقلاب آفریں اور خطرناک پیغام دنیا کو پہنچا رہے تھے۔ بھائی! ان حیوانوں سے جو انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں بالکل عاجز آ چکا ہوں۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو۔"

اب تو میں چکرایا کیونکہ میرے ترکش میں جو سب سے زیادہ کارگر تیر تھے ان کو میں یکے بعد دیگرے چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اس مرد شریف نے نہایت آسانی سے ہر ایک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح جلد نجات حاصل کروں کہ امداد غیبی آڑے آئی یعنی دفعتاً میری آنکھ کھل گئی۔

اور میں نے خود کو بستر پر پڑا پایا۔ اس وقت مجھے خیال پیدا ہوا کہ ہمیں دراصل اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تہذیب کے اصلی اور حقیقی عناصر کیا ہیں۔ اور ہم کن صفات رکھنے والے آدمی کو مہذب کہہ سکتے ہیں۔

تہذیب کا ایک نظریہ وہ ہے جو مذہب اور اخلاق کی تعلیم سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے پیش کیا ہے جو انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کو مقدم اہمیت دیتے ہیں اور انسان کی اخلاقی اور مذہبی سیرت کو پختہ اور مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق سیرت انسانی کی تہذیب کے لئے اس قسم کی صفات لازم ہیں۔ جیسے صداقت، ایمانداری، عقیدے کی پختگی، ایثار اور خلوص اگر ان کے مطمح نظر کو ایک لفظ میں ادا کیا جا سکے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان کو مجاہد بنانا چاہتے ہیں۔ جو ایمان اور عقیدے کا پکّا ہو، شکوک و شبہات سے محفوظ ہو اپنے عقائد پر سختی سے عامل ہو، اور ان کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لئے تیار رہو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگ جو مذہبی ہونے کا یا مذہبی سرگردگی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ان اوصاف سے متصف ہوتے ہیں یا ان سب کی تائید کرتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مذہب کی تعلیم کے اثر سے بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ان صفات کا اظہار کیا ہے اور جریدۂ عالم پر اپنا سکّۂ دوام ثبت کر دیا ہے۔

تہذیب کا دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور تمدنی پہلو کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی میل جول، دادوستد، مراسم اور تعلقات میں لطف اور خوشگواری پیدا کریں۔ اس معنی میں مہذب شخص وہ کہلاتا ہے جس کو آدابِ محفل سے بخوبی واقفیت ہو، لوگوں کے ساتھ شائستگی اور مروت سے پیش آئے، ان کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ لگائے اور کم از کم ظاہراً ان کا احترام کرے۔ اس سے ان کی مراد صرف اتنی ہی نہیں کہ روزمرہ کے میل ملاقات میں ناگواری پیدا نہ ہو بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے انسان اپنے حقوق و فرائض کو پہچانے اور اپنے اقوال و اعمال کی حدود سے واقف ہو کر زندگی بسر کرے۔ جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے وہ نہ صرف دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بلکہ انجام کار خود بھی زک اٹھاتے ہیں۔

تہذیب کا تیسرا مفہوم جو صدیوں تک تعلیم کی بحثوں اور تعلیم کے عمل پر مسلط رہا ہے یہ ہے کہ انسان میں بہت سی قوتیں اور صلاحتیں ایسی ہیں جو ترتیب کی محتاج اور اظہار کے لئے بے چین ہیں۔ ان کی ایک قدر مستقل ہے خصوصاً ان قوتوں کی جن کا تعلق ادب اور فنون لطیفہ کی تحصیل و تخلیق و تحسین سے ہے۔ تہذیب یافتہ ہونے کے معنی ہیں ان قوتوں کی تربیت اور اُبھار، انسان

کی زندگی محض حیوانی خواہشات تک محدود نہیں بلکہ اس کو تلاش حق اور مشاہدۂ جمال کی کاوش بھی رہتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیٹس کے لئے ہر حسین مرقع مسرت دائمی کا سرمایہ دار تھا۔ اس کی طرح ہر تہذیب یافتہ انسان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ حسین مناظر اور اشیائے سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس میں حسن شناسی کی قابلیت ہو۔ وہ ادب، موسیقی، مصوری اور شاعری کی تخلیق و تحسین کا ذوق رکھتا ہو۔ اس مفہوم کے مطابق آرٹسٹ کے انہماک میں ہمیں تہذیب کی شان نظر آتی ہے اور آرٹ کی نیرنگیوں میں ایک مہذب انسان کے لئے زندگی کا مشغلہ موجود ہے لیکن کام محنت، مزدوری، دست کاری وغیرہ جس کے ذریعہ عام لوگ اپنی روزی کماتے ہیں مقابلتہً حقیر اور کم درجے کے مشاغل ہیں جن کو نہ صرف یہ کہ تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ ان لوگوں کے تہذیب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدت تک بلکہ اب بھی آزادیہ لبرل تعلیم سے دماغی تعلیم یا فنون لطیفہ کی تعلیم مراد لی جاتی ہے اور جسمانی محنت اور مشاغل کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔

ان تینوں نظریوں میں سے ہر ایک میں بعض قابل قدر عناصر ایسے ہیں جن کے امتزاج سے تہذیب نفس کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بجائے خود اس کے پورے اور صحیح مفہوم پر حاوی نہیں بلکہ اگر ان میں سے

کسی ایک پر بھی شدت اور مبالغے کے ساتھ عمل کیا جائے تو انسان کی تہذیب وتربیت ناقص رہ جائے گی۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم مکمل تہذیب یافتہ انسان کی تصویر پیش کرو تو اس کے خدوخال بنانے میں شاید سب سے پہلے میں رواداری کی صفت کو پیش کروں۔ ممکن ہے آج کل کے زمانے میں جب ہر جماعت بلکہ ہر فرد اپنے اپنے مخصوص اور بظاہر جداگانہ مفاد کے لئے جدوجہد کر رہا ہے اور جماعتی وفاداری اور تعصب کو تقریباً ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، یہ کہنا بے وقت کی راگنی معلوم ہو لیکن میرا پرخلوص عقیدہ یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کے لئے رواداری کی صفت پیدا کئے بغیر تہذیب کی منزل تک پہونچنا ممکن نہیں۔ بہت سے نیک نیت اور نیک نفس لوگوں کی خوبیوں پر محض اس وجہ سے پانی پھر جاتا ہے کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی، وہ اپنی زندگی کو خود اپنے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب مستقل بنا لیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں گذرتا کہ حکمت الٰہی اس امر کی مقتضی ہے کہ انسانوں میں اختلافات ہوں اور وہ ان کا احترام کریں۔ سائنس اور جمہوریت کے اس دور میں جب انفرادیت کی تکمیل کے بغیر قومی ترقی ناممکن ہے، تنگ نظری اور تعصب خودکشی کا حکم رکھتا ہے۔ دماغی بیداری اور نشو ونما اسی جماعت میں ممکن ہے جس کے افراد میں ذہنی کشادگی ہو۔ جن کی دلچسپیاں متنوع ہوں جو علاوہ

اپنے تنگ اور محدود ذاتی اغراض و مقاصد کے دوسرے مسائل میں بھی دلچسپی
کے ساتھ شرکت کریں۔ ہندوستانی تہذیب کی تباہی کا سب سے بڑا ثبوت
یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی شدت کے ساتھ تعصب اور تنگ
نظری سرایت کر گئی ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے یہاں تک
کہ اس بیسویں صدی میں جبکہ ہندو مذہب پانچ ہزار سال پرانا ہو چکا ہے
مہاتما گاندھی کو اچھوتوں کی آزادی کے لئے اپنا نقد حیات پیش کرنے کی
ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے عقیدے کے مطابق، باوجود ہر قسم کی علمی اور
فنی ترقی کے اور ان تمام کارناموں کے جو ہندو تمدن کے امتیاز کا
باعث ہیں ایسی سوسائٹی جو اس طرح انسانی حقوق اور رواداری کا خون
کرے سراسر نفی تہذیب کرتی ہے۔ یہی حکم ان تمام قدیم تمدنوں اور معاشرتوں
پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے مختلف صورتوں میں اپنے بعض افراد کی حق تلفی
کی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان پر ظلم کو روا رکھا خواہ وہ غلامی کی رسم ہو یا
عورتوں کی حق تلفی ہو یا کمزور اقوام کے حقوق پر دست درازی ہو، بے شک
اس اصول کو قائم کرنے سے ہمیں افلاطون کے زمانے کی سوسائٹی سے
لے کر امریکہ جیسے متمدن اور مہذب ملک تک کی شان میں گستاخی کرنی پڑے گی
اور خود ہندوستان کے احساس خودی کو ٹھیس لگے گی، لیکن ہم کسی طرح
اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ صحیح انسانی تہذیب کا تقاضا یہ ہے

کہ ہم تمام انسانوں سے رواداری اور عدل کا برتاؤ کریں۔ جو فرد یا جماعت اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ تہذیب سے سراسر عاری ہے خواہ اس کی سطحی تہذیب کیسی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو۔

رواداری کے مفہوم میں ایک طرف تو یہ داخل ہے کہ انسان دوسروں کے جذبات اور خیالات کو سمجھے اور ان کا احترام کرے اور اپنی ذات میں اس درجہ وسعت پیدا کرے کہ اس میں دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے۔ دوسری طرف اس میں یہ صفت شامل ہے کہ انسان دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کے ساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کی طرح ان پر حکم لگانے کے بجائے ایک اہل دل انسان کی طرح ان کی وجہ اور علت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے یعنی اسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر اور کاوش ہو کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹا کر اس راستے پر ڈال دیا۔ جو شخص ہمیشہ دوسروں کے لئے محتسب بنا رہتا ہے، ان کی عیب جوئی کرتا رہتا ہے ان کی لغزشوں کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ ان پر سختی کرنا اور انھیں عذاب الیم کا مزہ چکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ ممکن ہے ایک اعلیٰ اخلاقی سیرت کا مالک ہو لیکن وہ تہذیب کے ایک نہایت لازمی اور شیریں عنصر سے محروم ہے۔ اس میں وہ فراخدلی اور رواداری نہیں ہے جو مجرم اور جرم میں امتیاز کرتی ہے، جس کی

وجہ سے ہمارے دل میں ایک بدبخت مُجرم کو دیکھ کر بھی یہ خیال گذرتا ہے کہ اگر توفیق الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو کیا عجب ہے کہ آج ہم بھی اسی حالت میں ہوتے یعنی وہ صفت جس کی بدولت عارضی اور اتفاقی فرق کی بنا پر ہم اپنی مشترک انسانیت کا احساس نہیں کھونے پاتے، یہ وہ حقیقی انسانی ہمدردی رحم اور انکسار ہے جو بعض لوگوں میں فطرتاً ودیعت ہوتا ہے اور بعض میں بہت سے تجربے اور آزمائشیں اٹھانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور بعض پر اس کا ذرا سا پرتو بھی نہیں پڑتا۔ ایسی ہمدردی اور فراخدلی کی مثالیں ہمیں ادب میں بھی ملتی ہیں اور اگر ہم خوش قسمت ہوں تو عملی زندگی میں بھی کبھی کبھی ایسے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس تہذیب حقیقی کے حامل اور شمع بردار ہیں۔ جو باوجود اپنے مواقع کے تنگ اور محدود ہونے کے باوجود جاہل اور ناواقف و ناتجربہ کار رہنے کے اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی اور رواداری سمجھنے اور معاف کرنے کے ایسے خزانے رکھتے ہیں جن کے مقابلے میں حقیقت بیں نظروں کے سامنے علم اور تجربے کی بھی کوئی وقعت نہیں بیشک علمی مشاغل اور مذاق کی مناسبت اور اتحاد بہت قابل قدر چیزیں ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اپنے دوستوں اور عزیزوں میں یہ نعمت میسر ہو لیکن ان سے زیادہ وقیع ہیں محبت اور ہمدردی کے وہ رشتے جن کو موت بھی نہیں توڑ سکتی، کس کام آئیں گی آخری ساعت میں دماغی مناسبت اور اتحاد

اور وہ ذہنی رشتے جن کو قائم کرنے کا لوگوں کو شوق ہوتا ہے۔ اس وقت انسان کو یہ چیزیں اپنے اصلی رنگ میں نظر آئیں گی، یعنی یہ کہ وہ زندگی کی محض بیرونی نمائش ہیں۔ بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈرتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرے بھی اس کے خوف میں شریک ہوں یا اس خوف کی نفسی وجہ اس کو سمجھائیں۔ وہ اس سرگرم اور محبت بھری آغوش کی تلاش کرتا ہے جس میں پناہ لے کر اپنے ڈر کو بھلا سکے۔ اسے اس شفیق اور تسکین بخش ہاتھ کی تلاش ہوتی ہے جس کو تھام کر وہ اس خوف کا مقابلہ کر سکے۔ بے شک امید ایمان اور صداقت ضروری ہیں۔ لیکن ضرورت ہے انسانیت کے لئے سب سے زیادہ بعض ہندوستانی ماؤں کی سی محبت کی جس میں انتہائی بے نفسی ہو صبر ہو، ان تھک تحمل ہو، ایسی محبت جس کو خطائیں اور لغزشیں کم نہ کر سکیں جو کسی معاوضے کی طالب نہ ہو، جس میں محبت الٰہی کی جھلک ہو، اس کے مقابلے میں اور تمام انسانی تجربے اور جذبات ہیچ اور پوچ ہیں۔

رواداری کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے دو باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے ساتھ رواداری برتنے لگے نہیں! اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہیئے بحیثیت ایک بااخلاق آدمی کے اس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے

تدارک کی کوشش کرے۔ اور اس کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کرے۔ لیکن بحیثیت ایک انسان کے اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی رکھنی چاہیئے اور انھیں راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں نے جن کو ادعائے تقدس تھا اور اپنے متعلق بہت خوش فہمی تھی، میری میگڈلین پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کی اور اس کو سنگسار کرنا چاہا تو اس عارف ربانی نے جس کی نظر اوروں سے زیادہ گہری اور دل اوروں سے زیادہ فراخ اور روادار تھا اپنی آواز بلند کی "پہلا پتھر وہی شخص پھینکے جس نے خود کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو" نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاتھ جو پتھر پھینکنے کے لئے اٹھے تھے اپنی اپنی جگہ پر ٹھٹھک کر رہ گئے اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ دل کے چور کو فراموش کر کے نظر کے سامنے والے چور پر ہاتھ اُٹھائے۔ اسی طرح جب رسالتمآبؐ بحیثیت ایک فاتح کے دوبارہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے اہل مکہ کے ہاتھوں ہر طرح کی ایذائیں اور بے حرمتی اٹھائی تھی، جہاں لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا خاتمہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا، تو آپ کی زبان پر یہی اعلان تھا کہ "لاتثریب علیکم الیوم" اور دل میں یہ دعا تھی کہ "بارالٰہا تو میری قوم کی خطاؤں سے درگذر کر کیونکہ وہ لاعلمی اور جہالت میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح اس جلیل القدر پیغمبرؐ کے برگزیدہ نواسے نے جو تاریخ عالم کا سب سے

بڑا مجاہد تھا خلق اور رواداری کی یہی شان کربلا کے میدان میں دکھائی جب کہ وہ ایسی مصیبتوں اور آزمائشوں میں گھرا ہوا تھا جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کی تمام عمر عبادت الٰہی اور خدمت خلق میں بسر ہوئی ہے۔ اس کے مخالف وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف اسلام اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے بلکہ شقاوت اور ظلم میں درندوں سے بھی کہیں بدتر ہیں۔ لیکن یہ خدا کا محبوب بندہ باوجود اپنے زبردست تقدس اور عظمت کے اپنی انسانی ہمدردی کو زندہ رکھتا ہے اور قاتل کے خنجر کے نیچے بھی، سجدے میں پڑا ہوا ان ظالموں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے ا یہ ہے تہذیب اور انسانیت کا انتہائی کمال جس کی پیروی کرنے کی کوشش اور آرزو ہر انسان کو کرنی چاہئے خصوصاً ان لوگوں کو جنھیں اسلام سے توسل کا دعویٰ اور اس پر فخر ہے۔ کیونکہ خود پیغمبر اسلام نے اپنی وجہ بعثت یہی بتائی تھی کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) اور لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ تخلقوا باخلاق اللہ (خود کو اخلاق الٰہی سے متصف کرو) اخلاق کا یہ تقاضا نہیں کہ انسان ذراسی نیکی کر کے اوچھے برتن کی طرح چھلک پڑے۔ نہ خطاکاروں کے حالات پر غور کرے نہ ان کی نیت معلوم کرنے کی کوشش کرے بلکہ ایک بلند مقام سے ان پر حکم لگانا شروع کر دے۔ اللہ تعالےٰ

کی نظر میں عزت اس شخص کی ہے جس کو تقویٰ یعنی خوف خدا ہو۔ وان اکرمکم عنداللہ اتقکم، اور سب سے بڑا گناہ غرور اور تکبر ہے جس نے ابلیس کو جو فرشتوں کا سردار تھا ہمیشہ کیلئے ذلیل وخوار کر دیا۔ جو زاہد اپنے زہد اور اتقا پر نازاں ہے اس کی عبادت گذاری کا پیشکش بھی درگاہ الٰہی میں قبول نہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ نکتہ نواز اس رند کو سرفراز کر دے جو نیازمندی کی شان سے اس کے سامنے جھکتا ہے۔

زاہد غرور کرد و سلامت نہ برد راہ　　　رند از رہ نیاز بدارالسلام رفت

دراصل تہذیب کا مسئلہ عدل اور توازن کا مسئلہ ہے یعنی ہمیں مختلف قوتوں اور مطالبات کے درمیان بلکہ مختلف اچھی اور مستحسن صفات کے درمیان ایک خاص تناسب قائم کرنا ہے۔ ہم نے ابھی غرور اور نیازمندی کا ذکر کیا ہے اس ضمن میں سچی تہذیب ہم سے بیک وقت دو ایسی صفات کی طالب ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے اپنی حقیقی وقعت اور عظمت کا احساس ہو اور وہ یہ جانے کہ وہ بیشمار امکانات کا مالک اور حامل ہے جن کو عمل میں لانا اور ان کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرنا اس کا فرض ہے۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی عقل کو بڑی حد تک توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے اور اسے اس کے فطری ماحول پر بہت بڑی قدرت کا حاصل

ہوگئی ہے، جو شخص عاجزانہ تقدیر پرستی کا شکار ہو جائے اور اس دنیا میں جو عالم اسباب ہے ہاتھ باندھ کر بیٹھ رہے وہ کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتا ہمارے نزدیک نہ وہ تہذیب یافتہ ہے نہ بن سکتا ہے کیونکہ ہم تہذیب کے فعالی مفہوم کے قائل ہیں اس کو ایک جامد اور مجہول چیز بنانے کے لئے تیار نہیں۔ جب اس میں اس احساس کی بدولت صحیح عزت نفس پیدا ہوتی ہے وہ نظام عالم میں اپنی اہمیت کو پہچانتا ہے اور یہ خود شناسی معرفت آلہی کا زینہ ہے۔ یہ پاس نفس اسی شخص میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جس کے اعمال کی محرک خود اس کی ذات ہو۔ دوسروں کی تقلید یا خواہش تحسین یا خوف ملامت اس کا راہبر نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہو بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے خیالات اور عقائد اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ جانے کہ بحیثیت انسان کے اسے ایسی آزادی فکر و عمل حاصل ہے جس سے کوئی قوت اسے محروم نہیں کر سکتی۔ جن لوگوں کے جذبات و خیالات اور اعمال و افعال دوسروں کا عکس ہوتے ہیں وہ محض رسم و رواج یا فیشن کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان میں نہ حقیقی جرأت پیدا ہوتی ہے نہ عزت نفس۔ ایسے شخص کو ہم اپنے نظریئے کے مطابق مہذب کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس عزت نفس کے ساتھ ساتھ جو انسان سے اس کے امکانات کا

احترام کرانی ہے، اسے یہ بھی احساس ہونا چاہئے کہ کائنات کی بے اندازہ وسعت کے مقابلے میں اس کی ہستی بہت چھوٹی اور کمزور ہے اور باوجود اس کی علمی اور عملی ترقی اور انکشافات کے اس کا علم وقدرت دونوں محدود ہیں۔ یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جو غلط اور جھوٹی خاکساری سے بہت مختلف ہے۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس عجز کی وجہ سے انسان کے عملی قوای معطل نہیں ہو جاتے بلکہ ان کو جدوجہد کی دعوت ملتی ہے لیکن وہ اپنی کامیابی پر غرور نہیں کرتا۔ نیوٹن جیسے عالم متبحر کا یہ قول کہ "علم کے بحر ذخار کے سامنے میری واقفیت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے کھیل رہا ہو" تہذیب نفس اور مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے اور سچے عجز کی نہایت عمدہ مثال ہے، دنیا میں جس قدر صحیح معنوں میں بڑے آدمی گذرے ہیں ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کے متعلق کبھی غرور یا تکبر نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی دوسرے انسانوں کو ذلیل نہیں سمجھا اور ان کے مقابلے میں اپنی فوقیت نہیں جتائی۔ یہ تہذیب اور شرافت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے ایک قدر مستقل کا مالک ہے اس لئے کسی کو اپنے علم یا وجاہت یا پرہیزگاری

کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو حقیر سمجھے۔ ایسے لوگ خواہ وہ جلیل القدر پیغمبر ہوں جیسے حضرت عیسیٰؑ، آنحضرتؐ، یا معاشرتی اور سیاسی رہنما جیسے مہاتما گاندھی، ہمیشہ انسانوں سے ان جیسے انسان بنکر ملتے ہیں، ان کے پاس آنے، ان سے ملنے جلنے، اپنا دکھ درد اور اپنی کمی اور کمزوری ان کو بتانے میں معمولی سے معمولی آدمی کو بھی باک نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ مثلاً بعض انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لے کر اپنی بلندی سے اتر کر، دوسروں کی سطح پر آئیں بلکہ وہ قدرتاً اور خود بخود دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی انسانیت مصلحت وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دلی جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے شخص کو مہذب انسان ماننے کے لئے تیار نہیں جو انسانیت کی حرمت کو نہ پہچانے اور تنگ ظرفی کی وجہ سے خود کو ہمیشہ دوسروں سے بلند تر اور بزرگ تر سمجھے۔ جو شخص تقدس کا دعویٰ کرتا ہے یا اپنی دولت، علمیت، یا وجاہت نسبی کی بنا پر غریبوں، جاہلوں، یا کم حیثیت لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے وہ نہ صرف تہذیب سے عاری ہے بلکہ اس میں احساسِ تناسب اور ذوقِ ظرافت بھی مفقود ہے، کیونکہ وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ خدا کی کائنات کس قدر وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے بلند آہنگ دعاوی

کیسے مضحک اور مہمل معلوم ہوتے ہیں۔ مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ اس قادرِ مطلق کی نظر میں ہر قسم کی خدمت کی وقعت اور اہمیت یکساں ہے بشرطیکہ وہ خلوص سے کی جائے خواہ وہ کسی ملک کی سیاست کا چلانا ہو یا زمین کا کھودنا مذہب کی تبلیغ کرنا ہو یا سڑکوں اور مکانوں کی غلاظت کو دور کر کے ان کی صفائی کرنا۔ ہم اس بات کی وجہ اور مصلحت نہیں سمجھ سکتے کہ کیوں ایک شخص کے حصے میں شہرت اور عزت وافتخار کی زندگی آتی ہے یا کسی مہتم بالشان مقصد کے لئے شہرت اور ناموری کے ساتھ جان دینا اور دوسرے کے حصے میں ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک اندھیرے میں ٹٹولنے کے مانند ہو اور جس کا انجام گمنامی اور ذلت ہو۔ ہم یہ نہیں جانتے لیکن ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو مفید کام بھی خلوص کے ساتھ کیا جائے وہ مقبول ہے اور اس کی وقعت مسلّم۔

لہٰذا ہم تہذیب کے لئے ایک شرط لازم یہ قرار دیتے ہیں کہ ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتے کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملاتا ہے اور کسی خارجی یا نمائشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ تر نہ سمجھے۔ نہ ہی اسے کسی شخص کو اس بنا پر حقیر سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ اس کے کام کی نوعیت بہت معمولی ہے یعنی یہ کہ مثلاً وہ چمار یا خاکروب یا کمہار ہے۔ ان کاموں کی ضرورت مستقل ہے اور ان کو

تہذیب کا مخالف یا اس سے بے تعلق سمجھنا ہمارے نظریہ تہذیب کی رو سے کسی طرح جائز نہیں بے شک یہ نقطۂ نظر تہذیب کے قدیم اور مستند مفہوم کے بالکل خلاف ہے لیکن موجودہ اخلاقی اور فلسفیانہ تحریکات اور بہترین قدیم تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محنت مزدوری اور تہذیب میں کوئی لازمی تناقض نہیں۔ گزشتہ زمانوں میں اگرچہ لوگوں نے تہذیب کے مفہوم کو ان چند مشاغل تک محدود کر دیا تھا جن میں وہ اپنے ذاتی شوقوں مثلاً علم کی تحصیل، عبادت گذاری، فنون لطیفہ کی تخلیق و تحسین کی تشفی کرتے تھے اور اس کو دنیاوی مکروہات اور عملی زندگی کی کشمکش سے گریز کرنے کے لئے ایک جائے پناہ سمجھتے تھے لیکن تہذیب کا یہ مفہوم نہایت سطحی، نہایت ناقص اور اوچھا ہے۔ اس میں زندگی کا جوشیلا خون بالکل نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی دماغی اور روحانی خود غرضی کا مرادف ہے اور اصلیت کے بجائے بیرونی جلا اور نمائش پر زور دیتا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے تہذیب کا سرچشمہ کتابیں اور درسی علوم ہیں اور اس کا مقصد ہے تنہائی میں انفرادی قوتوں کی تربیت کرنا۔ لیکن ہم تہذیب کو بیکار یا با کار معلومات کا مجموعہ ماننے کے لئے تیار نہیں اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو شخص مخزن علوم ہو وہ مہذب انسان بھی ہو بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ وہ تہذیب سے بے بہرہ رہے گا

کیونکہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ذات ہو گی یا کتابیں نہ کہ انسانی
زندگی اور اس کے وہ تلخ و شیریں تجربات جن کی چاشنی چکھنے کے بعد آدمی
انسان بنتا ہے۔ ہمیں بارہا ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود عالم
اجل ہونے کے تہذیب سے محروم ہوتے ہیں۔ پروفیسر اشپرانگر نے اپنے
نظریہ نفسیات میں انسانوں کی جو قسمیں قرار دی ہیں ان میں ایک قسم
(Derakademische Mensch) یعنی نظری انسان کی بھی ہے
جو تلاش حق اور طلب علم کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے اور اس میں بالکل
محو اور فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی قابلِ قدر
ہے اور اپنے نتیجۂ کار کی رو سے خدمت خلق کر رہا ہے۔ لیکن بحیثیت
ایک معاشرتی فرد کے اگر اس کو اپنے گردوپیش کے انسانوں سے کوئی
دلچسپی نہ ہو، اگر وہ ان کے دکھ درد اور مشاغل میں شریک نہ ہو، علاوہ علمی
معاملات کے اور تمام معاملات کی طرف سے بے اعتنائی کرے، اس کی
قوت عمل معطل ہو جائے، وہ انسانی جذبات کا احترام نہ کرے تو ہم اس کو
بحیثیت انسان کے بہت ناقص اور تہذیب سے عاری سمجھیں گے۔ تہذیب
کا جدید نظریہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد کام اور خدمت اور عملی تجربے پر رکھنی
چاہیئے نہ کہ کتاب اور نظری علوم پر۔ وہ تہذیب جو افراد میں حقیقی شرافت
اور انسانیت کی روح پیدا کرتی ہے، محض مطالعۂ عبادت گذاری یا

آرٹ میں انہماک کا نتیجہ نہیں بلکہ خدمت خلق سے، محنت سے، دوسرے انسانوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے، ان کے جذبات و خیالات کو سمجھنے، ان سے ہمدردی اور محبت کرنے اور ان کے رنج وراحت میں شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجربات دل کو نرم اور دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ کارلائل کا یہ قول مشہور ہے کہ "کام عبادت ہے۔ ہر کام جو خلوص سے کیا جائے برکت کا باعث ہے جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے اور کوئی برکت طلب کرنے کی ضرورت نہیں" خدمت بشرطیکہ وہ خلوص اور دانشمندی کے ساتھ کی جائے رحم کی صفت کی طرح "دوچند متبرک ہے" وہ اس کے لئے بھی برکت ہے جو خدمت کرے اور اس کیلئے بھی جس کی خدمت کی جائے۔ اس خدمت کے طفیل علمی کام کرنے والوں میں وہ برتری کا احساس پیدا نہیں ہوتے پاتا جو انھیں محنت مزدوری کرنے والوں سے جدا رکھتا ہے اور بیشمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے ہر وہ تحریک جو "تحریک خاکساران" کی طرح لوگوں میں محنت اور خدمت کے شوق اور صلاحیت کو بڑھائے تہذیب کی اشاعت میں براہ راست مدد دیتی ہے۔

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ رواداری کا ایک غلط مفہوم وہ بھی ہے جو آج کل رائج ہوگیا ہے اور جو اس کو تقریباً بے اعتنائی کا مرادف قرار

دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جس کے نزدیک کسی اصول یا عقیدے کی کوئی اہمیت نہیں، نہ تو خود اس کے کوئی پختہ اصول و عقائد ہیں نہ وہ دوسروں سے ان کے اصول اور عقائد پر اختلاف یا جھگڑا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سب برابر ہیں۔ اس لئے وہ سب کی طرف سے یکساں بے پروائی کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "ہم اپنے ابنائے جنس پر محتسب بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ہم اپنے بھائیوں کے رکھوالے نہیں ہیں"۔ چنانچہ جن امور کے متعلق ارباب فکر شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں مثلاً یہ کہ خدا ہے یا نہیں۔ سیاست میں فلاں مسلک صحیح ہے یا کوئی اور، اچھوتوں کو حقوق دیئے جائیں یا نہیں۔ عورتوں کا نظام معاشرت میں کیا مرتبہ ہے، انسان کی زندگی کا مقصد جلب منفعت ہے یا خدمت خلق ان سب مسائل کی اس کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے خیال کے مطابق بسر کرنی چاہیئے دوسروں سے بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں۔ لیکن یہ حقیقی رواداری نہیں۔ یہ ذہنی رویہ فلسفۂ تشکیک پر مبنی ہے جس کو بعض مفکرین نے بہت وقعت دی ہے۔ مگر اس کو عقلی آزادی اور آزاد خیالی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس رویہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ اس نام نہاد متشکک نے کوئی خاص نظام اقدار، کوئی معیار زندگی قائم نہیں کیا، اس کی زندگی کسی

زبردست مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں۔ اس کے لئے صرف یہی شرط ہے کہ وہ عقائد ہماری ذہنی آزادی اور غور و فکر کو معطل نہ کریں۔ اس شرط کے ساتھ عقائد کی پختگی تشکیل و تنظیم حیات کے لئے لازم ہے۔ سچی رواداری کی تعریف یہ ہے کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے مخصوص خیالات اور عقائد رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ ان پر کاربند ہیں۔ لیکن عقلاً اور عملاً دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف خیالات اور عقائد رکھتے ہوں، ہم اپنی رائے کو جوش اور قوت کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کرتے اور انھیں اپنا ہم رائے بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم خندہ پیشانی اور بردباری کے ساتھ ان کی بالکل مخالف رائے کو سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے تیار رہیں اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی یا ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔
اس ذہنیت کی تربیت کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم افراد میں تجسس کا مادہ اور شوق کی وہ زندگی اور بیداری قائم رکھیں جو بچپن کا خاصہ ہے لیکن ناسازگار ماحول کی وجہ سے ابتدائی عمر میں دب جاتا ہے اور لوگوں پر قبل از وقت کہولت طاری ہو جاتی ہے۔ جس طرح یہ بات تہذیب کے مطالبات کے خلاف ہے کہ ہم بہ جبر اپنے خیالات دوسروں پر عائد کریں اسی طرح

یہ بھی تہذیب کے منافی ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے خیالات اور عقائد کے بوجھ میں دب کر نئے خیالات اور نئے حقائق کا استقبال نہ کر سکیں ہندوستانیوں پر تو خاص کر کے قبل از وقت کہولت طاری ہو جاتی ہے اور دماغی جدت اور جولانی کا مادہ باقی نہیں رہتا۔ جس طرح نو عمری کی شادی یا ملازمت جسمانی شباب کی موت ہے اسی طرح عقائد اور خیالات کا اس طرح جامد ہو جانا کہ انسان میں سوچنے اور غور کرنے کا مادّہ نہ رہے اور وہ ہر نئی بات سے گھبرائے ذہنی شباب کا خاتمہ ہے۔ ایمان اور عقیدے کی اہمیت تسلیم۔ لیکن انسان کو کسی طرح یہ مناسب نہیں کہ وہ آنکھوں پر اندھیریاں لگا کر زندگی بسر کرے۔ اسے تو شہید جستجو ہونا چاہیئے۔

ہمہ ساز ناتمام ہمہ سوز آرزو یم — بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجو یم

ہم نے تہذیب کا جو مفہوم مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کے ضمن میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک پرجوش اور سرگرم مجاہد تہذیب یافتہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مجاہد سے یہاں ہماری مراد وہ شخص ہے جو کسی خاص مقصد کی حمایت یا تحصیل میں اس درجہ منہمک ہو جائے کہ اس کے لئے اور تمام چیزوں کو قربان کرنے کو تیار ہو اور اُسے اس انہماک میں اتنا غلو ہو کہ وہ اور تمام مفاد اور اغراض کو نظر انداز کر دے۔ اس ذیل میں صرف جنگجو سپاہی ہی شامل نہیں بلکہ

وہ تمام لوگ بھی جو کسی نیک اور مفید کام میں مثلاً علم کی تحصیل یا مذہب کی اشاعت اور حمایت یا سیاسی مقاصد کے لئے اپنا تن من دھن نثار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یقیناً قابلِ احترام ہیں اور دنیا میں اکثر بڑے بڑے کاموں کو ایسے ہی لوگوں نے انجام دیا ہے جن کو کسی ایک خیال کی دھن ہو جاتی ہے۔ کسی ایک چیز سے اس درجہ شغف ہو جانا کہ وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے کامیابی کے لئے اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ مجاہد کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جن کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ اور ان کو تہذیب کا لازم جزو سمجھتے ہیں۔ اس میں عقیدے کی پختگی ہوتی ہے۔ جب اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک معاملے میں حق پر ہے تو وہ اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار رہتا ہے۔ ہم اس کے ایثار اور یک جہتی کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ جرأت درکار ہے جس میں جسمانی، دماغی اور اخلاقی جرأت تینوں شامل ہیں۔ اس کو تکلیفوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اکثر سوسائٹی کی ناپسندیدگی اپنے سر لینی پڑتی ہے لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو آدمی بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ جسمانی تکلیف یا معاشرتی مخالفت یا ذہنی تنہائی کے خوف سے اپنے مستحکم عقیدوں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس شخص میں تہذیب کی صفات پیدا ہونی مشکل ہیں۔ لہٰذا جرأت کو ہم تہذیب کے لئے ایک

شرط لازم قرار دیتے ہیں بشرطیکہ اس میں اخلاقی جرأت کی یہ شان بھی ہو کہ جب انسان اپنی کوئی غلطی محسوس کرے یا دوسرا اس کی غلطی محسوس کرائے تو وہ بے کم و کاست اپنی غلطی کا اقرار کرے اور جھوٹی شرم سے مغلوب نہ ہو جائے۔ یہ جرأت کی سب سے اعلیٰ شکل ہے جو گویا انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف دکھانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے بڑے دل اور جگر کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر لوگ عزت نفس کا ایک غلط مفہوم اپنے ذہن میں قائم کرکے اس کے غلام ہو جاتے ہیں اور اپنی جگہ سے ہٹنے یا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے جن کو عام طور پر بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے اور جن کی تمام حرکات اور افعال عوام کی نظر میں رہتے ہیں۔ بہرحال اس جرأت کو اپنے میں پیدا کرنا، ہر کام کو جوش، خلوص اور انہماک کے ساتھ انجام دینا مشکلات کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا، مجاہد کی صفات ہیں اور ان کی ہمیں دل سے عزت کرنی چاہیئے۔

لیکن یہ مجاہدانہ صفات بجائے خود ایک شخص کو ہمارے خیال میں مہذب نہیں بنا سکتیں۔ تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک ہمہ گیر نظر ڈال سکے، اس کی طبیعت میں توازن ہو، جب اس کے سامنے کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ اس کے تمام رخوں پر غور کرنے

اور تمام متعلقہ اشخاص اور واقعات کو جانچنے کے بعد کوئی طریقۂ عمل اختیار کرے۔ حقوق اور مطالبات کے اسی توازن کو مذہب اور فلسفہ نے عدل کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ "اعدلوا ہو اقرب للتقویٰ"۔ مجاہد اکثر معاملہ کا ایک ہی رُخ دیکھتا ہے اور یہ وہ رُخ ہوتا ہے جس سے اس کو بہت گہری ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظر کی یک جہتی سے اس کی قوت عمل دو چند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ عقل سلیم سے کام نہیں لیتا اور اکثر انجام کار نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں اپنے تجربے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ علم کے مجاہد کا ذکر اوپر آچکا ہے، جو طلب علم میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کی اس کو شناخت نہیں رہتی اور وہ اپنے معاشرتی فرائض کو ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح بعض مذہبی مجاہد ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کی تبلیغ اور ان کی حمایت میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان میں احساس تناسب باقی نہیں رہتا۔ وہ ہر ہر نقطے اور شوشے کی غلطی کو کفر کا مرادف سمجھتے ہیں۔ کسی قسم کے اختلاف کے روادار نہیں ہوتے جو شخص ان سے اختلاف کرتا ہے اسے عذاب ابدی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب اور ان کے پیرؤوں کی بے حرمتی اور دل آزاری کرتے ہیں اور اس کو باعث ثواب سمجھتے ہیں، ان میں محبت ہمدردی اور رواداری کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہوں لیکن اس قدر غلو اور تعصب اور آنکھوں کو تقریباً بند کر لینا نہ صرف تہذیب اور انسانیت کے منافی ہے بلکہ روح مذہب کے بھی خلاف ہے بیشک حق پر ہونا بہت اچھا ہے، اس کی اشاعت نہایت ضروری ہے ، اس کے لئے ایثار اور قربانی کرنا بہت بڑی قابل تعریف بات ہے لیکن انسان کے دل میں جو خطا اور نسیان کا پُتلا ہے، کبھی یہ خیال بھی تو آئے کہ ممکن ہے وہ غلطی پر ہو یا اگر غلطی پر نہیں تو ممکن ہے وہ بھی راستی پر ہو اور دوسرے لوگ بھی، کیونکہ خدا کی وسیع خدائی میں اکثر ایک ہی منزل مقصود تک پہنچنے کے ایک سے زیادہ راستے ہو سکتے ہیں، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مکمل تہذیب یافتہ انسان میں مجاہد کا سا عزم اور حوصلہ اور جرأت اور ایثار اور قوت عمل ہو، وہ اپنے مشاغل اور فرائض کو جوش اور انہماک کے ساتھ انجام دے لیکن اپنے احساس تناسب اور اپنے توازن کو قائم رکھے اور عقل اور جذبات کے تقاضوں کو عمل کی یورش میں نظر انداز نہ کرے۔ کسی ایک خیال کے اوٹ میں تمام دنیا اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مجاہدوں کے لئے بہترین مثال تاریخ اسلام کے مجاہد اعظم امام حسین علیہ السلام کی ہے، جنھوں نے باوجود اپنے شوقِ شہادت کے، باوجود راہِ خدا میں سرفروشی کرنے کے، باوجود انتہائی مظالم اور

تکالیف برداشت کرنے کے حقوق العباد کو بھی کما حقہٗ ادا کیا اور عدل و تہذیب اور انسانیت کی ایک ایسی مثال قائم کردی جو ہمیشہ دنیا کے لئے شمع ہدایت بنی رہے گی۔

یونان قدیم کے مفکرین نے ان صفات کو جو تہذیب کے کمال کے لئے لازمی ہیں ایک لفظ (Sophrosyne) سے ادا کیا ہے۔ اس لفظ کی بالکل ٹھیک تشریح کرنی مشکل ہے۔ "اعتدال" اس کا ایک جزو ضرور ہے لیکن اس صفت کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا۔ حیا اور خاکساری، جس حد تک بیجا تہور اور ادعا، خودی اور خودنمائی کو روکتی ہیں، اس میں شامل ہیں۔ لیکن اس کے مکمل مفہوم پر محیط نہیں یہ سکون سے بھی بڑھ کر ہے اگرچہ سکون اس کا ایک جزو ضرور ہے۔ اس میں بے نفسی بھی شامل ہے اور ایک ایسا معیار اقدار بھی جو گھٹیا درجے کی خوشیوں اور فائدوں کو حقیر سمجھے۔ اس میں اعتدال اور ضبط نفس کی جو شان مضمر ہے وہ کسی بیرونی جبر یا دباؤ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ آزادی اور اس کے صحیح استعمال کا ثمر ہوتی ہے۔ سر آرتھر کوئلر کوچ نے اپنے ایک لکچر میں اس کا ترجمہ Assured Mental grace. کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ جس شخص میں یہ صفت ہوتی ہے وہ اپنی قابلیت کی حدود سے واقف ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہر قسم کے لوگوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس کو اپنی جگہ پر خاموشی اور اطمینان

کے ساتھ اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنی علمی تربیت کی بدولت ہر علم دوست حلقے میں شریک ہو کر مستفید ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہ وہاں سے گھر جاتا ہے تو وہ عقل مند ترین لوگوں کے قول کو بھی فیصلے کے لئے اپنے ضمیر کے سامنے پیش کرتا ہے کیونکہ اس کا ضمیر اور اس کے دل و دماغ اپنے ہیں جن میں صلاحیت اور سمجھ ہے اور وہ جانتا ہے کہ خواہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کتنی ہی کسر نفسی کے ساتھ جانچے اس کا فرض ہے کہ وہ معاملات کو خود سمجھے اور ان پر غور کرے۔ اس بیان سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ تہذیب کے مفہوم میں ہمہ گیری سکون اور عزت نفس شامل ہیں اور ہر قسم کا اوچھاپن، جھوٹی شیخی اور جھوٹی کسر نفسی تہذیب حقیقی کے منافی ہیں۔ اس مفہوم کی ایک عملی اور شخصی مثال حالی کے لاثانی اور غیر فانی مرثیہ غالب میں مل سکتی ہے ۔

بلبل ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج — رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے — زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

مظہر شانِ حسن فطرت تھا
معنیٔ لفظ آدمیت تھا

تہذیب یافتہ انسان کی ایک اور امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کے لئے ہر نیا تجربہ علم و حکمت کا ایک خزانہ ہوتا ہے جس سے اس کی دانشمندی، اس کی بردباری، اس کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے اس کے لئے تجربات کی مثال ایسی نہیں جیسے کسی فائل میں بہت سے کاغذات شامل کر دئیے جائیں بلکہ وہ اس کی وسعت پذیر شخصیت میں زیادہ گہرائی اور معنویت پیدا کرتے ہیں وہ ناگوار تجربات پر بھی چین بجبیں نہیں ہوتا نظام عالم اور خالق عالم کو الزام نہیں دیتا بلکہ ان سے بھی سبق اور استحکام حاصل کرتا ہے اس کے لئے دکھ سکھ سے زیادہ سبق آموز بن جاتا ہے کیونکہ مصیبت اور رنج کی آزمائش میں سے نکل کر اس کی طبیعت میں زیادہ نرمی، زیادہ ہمدردی اور زیادہ سمجھ پیدا ہو جاتی ہے۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اس لئے انسان کی تہذیب اور تربیت میں ہر تجربہ خواہ وہ ناگوار ہو یا خوشگوار معین ہوتا ہے۔ مرغ اور ہدہد کے قصے میں جس کو اقبال نے نظم کیا ہے اسی طرف اشارہ ہے۔

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید
خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید

بدگفت فطرت چمن روزگار را ۔۔۔ ہم سوز خود و ہم زغم دیگراں تپید
گفت اندریں سراکہ بنایش فتادہ کج ۔۔۔ صبحے کجا کہ چرخ درو شامہا نچید

یہ مرغ تہذیب سے عاری تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دکھ درد مصیبت کو کس طرح معین کار بنایا جاسکتا ہے۔ ایک تجربہ کار اور رمز شناس ہدہد نے اس کی نالہ و زاری کو سن کر اس پر رحم کھایا اور کانٹے کو نکال دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ زریں نصیحت بھی کی جو غور کے قابل ہے۔

گفتا کہ سود خویش زجیب زیاں بیار ۔۔۔ گل از شگاف سینہ زرناف آفرید
درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی ۔۔۔ خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

عام لوگوں کی زندگی تو ذرا ذرا سی آزمائشوں اور تکلیفوں سے تلخ اور بے کیف ہو جاتی ہے لیکن وہ اہل دل اور اہل نظر جن کو قدرت کی طرف سے نفس مطمئنہ ملا ہے اور جنھوں نے اصلی تہذیب کو حاصل کیا ہے انھیں تجربات کی بنا پر بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک مکان یا زمین کی طرح کسی شخص کی ملکیت ہو سکے، وہ تو ایک خاص انداز سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تجربوں کی مسلسل تنظیم و تشکیل کرتا رہے اور ان کی مدد سے پرانی چیزوں سے بھی نیا لطف اور کیف حاصل کرے۔ بقول امریکہ کے معلم اعظم ڈیوی

(Dewy) کے تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت ہمیشہ بڑھتی رہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور زیادہ گہرے معانی حاصل کر سکے۔یہی وجہ ہے کہ اگر ایک تہذیب یافتہ شخص جس کے ذوق جمال کی تربیت ہوئی ہے تاج محل کو دیکھتا ہے تو اُسے اس عمارت میں ایک ایسا جہانِ حُسن دکھائی دیتا ہے جو ایک ناواقف بچے یا ایک جاہل بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔یہی حالت ہر قسم کی تحسین اور لطف اندوزی کی ہے۔ تہذیب خود انسان کی ذات اور اس کے مذاق میں ایسی معنویت پیدا کر دیتی ہے کہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کو معمولی نظر آتی ہیں اس کے لئے سرمایۂ مسرت وتحسین ہوتی ہیں۔ ورڈسورتھ کا قول ہے کہ ہرے بھرے جنگل کی ہوا کا ایک جھونکا ہمیں انسان اور خیرو شر کے متعلق وہ باتیں سکھاتا ہے جو دنیا کے تمام دانشمند مل کر بھی نہیں بتا سکتے، لیکن اس جھونکے کے پیغام کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لئے صاحبِ دل اور صاحبِ نظر ہونا شرط ہے۔اس لئے سعدی ؒ نے اپنے شعر میں" نظر ہوشیار" کی شرط لگا دی ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

لیکن جس طرح یہ تہذیب یافتہ انسان ایک طرف معمولی چیزوں میں معنویت اور دل آویزی ڈھونڈھ نکالتا ہے اسی طرح وہ معیار اقدار

کی رو سے بہت سی ان چیزوں کو حقیر سمجھتا ہے جو عوام الناس کے لئے بہت وقیع ہیں۔ اور جن کے لئے وہ تمام عمر جدوجہد کرتے ہیں اور حق تلفی اور ظلم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں مثلاً دولت، شہرت، اعزاز و خطابات۔ وہ ان کے لئے اپنا سکون قلب اور قناعت کھونے کو تیار نہیں ہوتا، بلکہ لوگوں کی مجنونانہ جدوجہد پر ہنستا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ دنیاوی قوت اور عزت کے لئے ایک حد تک جدوجہد کرے کیونکہ ہم تہذیب کو ترک دنیا کا مرادف نہیں سمجھتے لیکن وہ اس کشمکش میں ہرگز اس درجہ منہمک نہیں ہوتا کہ اپنے احساس تناسب اور ذوق ظرافت کو کھو بیٹھے اور جن چیزوں کی حیثیت محض ذرائع کی ہے اُن کو مقصد زندگی بنا لے۔

آخر میں ہمیں اس مسئلہ سے بحث کرنی چاہیئے کہ ہمارے نقطۂ خیال کے مطابق مقصد حیات کیا ہے اور ہمارے نزدیک تہذیب یافتہ انسان کا رویہ اس بارے میں کیا ہونا چاہیئے۔ جن لوگوں کی تمام تر امیدیں اسی دنیا کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کا خیال ہے کہ چراغ حیات گل ہو جانے سے انسان کی روح اور شعور و احساس بھی فنا ہو جاتے ہیں ان کا تو اعتقاد لازمًا یہی ہونا چاہیئے کہ مدت حیات کو غنیمت جان کر انسان کو جو کچھ لینا، حاصل کرنا اپنے قبضہ اور تصرف میں لانا ہے اس کو لے لے۔ اس لحاظ سے انسان کا فرض اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ

وہ دنیا کی جس قدر نعمتوں پر قبضہ کرسکے کرے اور کنجوسوں کی طرح جب تک ممکن ہو ان پر قبضہ کئے بیٹھا رہے اور ان کو صرف نہ کرے۔ زندگی کے اس نظریہ کی مختلف مثالیں ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داری کا نظام، سیاست میں ملک گیری اور اقلیم رانی کی ہوس، معاشرتی تعلقات میں تنگ نظری اور خود غرضی یہ سب اس مفروضے پر قائم ہیں کہ انسان بالطبع خود غرض ہے، وہ لینا چاہتا ہے، ذخیرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کو دینا اور خرچ کرنا ناگوار ہوتا ہے۔ ملکیت اس کی جبلت ہے۔ خدمت اس کی فطرت کا جزو نہیں اس کے برخلاف دوسرا نظریۂ زندگی وہ ہے جو بہترین انسانوں کا ہمیشہ رہا ہے۔ اس کی رو سے زندگی امانت الٰہی ہے جس کو خدا کی راہ میں فیاضی کے ساتھ بسر کرنا چاہئے انسان کو مختلف قوتیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ انھیں اعلیٰ انسانی مقاصد کی خدمت میں صرف کرے یہ نظریہ نفس پرستی اور عیش پسندی کے بجائے خدمت اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے اور لوگوں کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی تمام قوتوں کو ایک کنجوس دولتمند کی طرح مقفل کرکے نہ رکھیں بلکہ ان کو بے دریغ رفاہ عام کے لئے صرف کریں کیونکہ جس طرح علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے اسی طرح انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو خدمت کے ذریعے اور زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے نفس کو خدا کی راہ میں بیچ ڈالتے ہیں وہی اس کی اصلی

قیمت حاصل کرتے ہیں کیونکہ بقول حضرت عیسیٰ کے" وہی شخص اپنی روح کو پائے گا جو اُسے کھو دینے کے لئے تیار ہو" اس لحاظ سے اسلامی تعلیم قدیم اور جدید مغربی تعلیم اور فلسفہ پر بہت نمایاں فوقیت رکھتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے عصرِ جدید میں ایک مضمون "تعلیم کی ظاہری غرض اور انتہائی مقصد" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں انھوں نے اس امر سے بحث کی ہے کہ مقصدِ حیات اور تعلیمی نصب العین کے بارے میں مغربی اور اسلامی نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے؟ جدید تعلیم یا مغربی فلسفہ قرار دیتا ہے کہ اعلیٰ خود غرضی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اعلیٰ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ عقلِ دور اندیش اپنی غرض اور مصلحت کو سمجھے۔ یہ نہیں کہ جس بات سے آج آرام و آسائش معلوم ہوتی ہے اور کل کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے اس سے ضرر ہو اس کو انسان اچھا سمجھ کر کرنے لگے۔ یہ تو ادنیٰ غرض ہے" اسلامی تعلیم یہ کہتی ہے کہ شخصی اور نوعی غرض بالکل جائز اور بجا ہے مگر وہ ادنیٰ درجے کی ہے۔ اصلی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ذاتی خواہشوں کو مشیت ایزدی اور قوانین کل کے تابع کر دے۔" یا ایہا الذین آمنوا انفقوا مما رزقنٰکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ ط اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی کل قوتوں اور دولت کو یہاں خرچ کرے کہ یہ زندگی اسے اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل، سعی اور ایثار سے حیاتِ ابدی حاصل کرے۔ جو لوگ اس اصول کو نہیں سمجھتے اور خدا کی دی ہوئی قوتوں اور

نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ کافر یعنی ناشکرے اور ظالم ہیں اور تاریکی میں ہیں۔ جدید تعلیم سکھاتی ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو کیونکہ کل تم مرجاؤ گے۔

نوروز و نو بہار دمے و دلبرِ خوش است بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ کھاؤ پیو مگر حالت اعتدال سے نہ نکلو کیونکہ بے اعتدال اور بے جا کام انسانیت کی موت ہے" (عصر جدید جلد ۹) ہم نے جس تہذیب کی تعریف اور تشریح اس مضمون میں کی ہے وہ قطعی طور پر تنگ نظری، خود غرضی اور خود پسندی کے منافی ہے اور انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بہترین اور بلند ترین مقاصد انسانی کیلئے صرف کرے اور ان کی تحصیل کے لئے مزدوروں کی طرح کام کرے۔ ہم تہذیب کو عیش نصیب اور فرصت پسند لوگوں کا مشغلہ تفریح بنانے کے لئے تیار نہیں ہیں ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو عقل سلیم اور سلامت روی کے ساتھ اپنے تمام حقوق و فرائض پر ہمہ گیر نظر ڈال سکیں اور ان کو خلوص اور انہماک کے ساتھ پورا کریں۔

میں اس مضمون کو ختم کرکے اس پر نظر ڈالتا ہوں تو میرے دل میں دو مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں کبھی تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب نفس کے لئے جن صفات کو لازم قرار دیا ہے وہ سب متفق علیہ ہیں، میں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جس پر کسی قدامت پسند شخص کو بھی اعتراض ہو۔ رواداری عدل، ذہنی آزادی دلچسپیوں کی بیداری، زندگی کو امانت آلہی سمجھنا کام کو خدا کی نعمت خیال کرنا اس کو

عار نہ سمجھنا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کو کم از کم نظری طور پر ہر زمانہ میں لوگوں نے تسلیم کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب کے مروجہ مفہوم کا کماحقہ احترام نہیں کیا، میں نے تہذیب یافتہ لوگوں کی شان میں بہت سی گستاخیاں کی ہیں، ان سے کام اور محنت کا مطالبہ کیا ہے، ان کے احساس خودی کو ٹھیس لگائی ہے اور انھیں ان کے مقام علیین سے اتار کر معمولی جاہل اور ناشائستہ مزدوروں اور کسانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے دل میں یہ شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بالکل معصوم اور بے خطا نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے وہ کسی معاملے میں غلطی پر ہوں، میں نے فنون لطیفہ، علمیت، مذہبیت اور شائستگی پر زیادہ زور دینے کے بجائے انسانیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان تمام بیان سے تہذیب یافتہ انسان کی جو تصویر مرتب ہوتی ہے وہ اتنی دلکش اور نظر فریب ہے یا نہیں جیسی اس کی روایتی تصویر۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ تہذیب کا یہ مفہوم زیادہ مفید، زیادہ پائیدار اور زیادہ عملی ہے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ انسان خاص طور پر خوش نصیب ہو اور اس کے حالات غیر معمولی ہوں بلکہ اس تہذیب کی شان ہر وہ شخص اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے جو خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر آمادہ ہو۔

اُردو اکادمی کے مقالے

(۱) نفسیات مذہب۔	قیمت ۵ آنہ
(۲) جمال الدین افغانی۔	قیمت ۵ آنہ
(۳) روح تہذیب۔	قیمت ۵ آنہ
(۴) عقیدہ اعجاز قرآن کی تاریخ۔	قیمت ۵ آنہ
(۵) مسلمانوں کی آئندہ تعلیم۔	قیمت ۵ آنہ
(۶) دلی کی دوسو برس کی تاریخ۔	قیمت ۵ آنہ
(۷) تاریخ ہند کی تمہید۔	قیمت ۵ آنہ
(۸) ہندوستان کے آثار قدیمہ۔	قیمت ۵ آنہ

قسم اول مجلد قیمت ۱۲ آنہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دھلی

Date	No.	Date	No.